# فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۱۹

(بہ ترتیب حروف تہجی)

ماہ جولائی ۱۹۷۶ء تا دسمبر ۱۹۷۶ء

| شمار | مضمون نگار | صفحہ | شمار | مضمون نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۰ | سید صباح الدین عبدالرحمن | ۳۲۲-۲۴۲، ۴۰۲-۳۹۲، ۴۷۰ | ۱۷ | محمد نعیم صدیقی، ندوی، ایم اے (علیگ) | ۱۸۹-[illegible]، ۳۶۵ |
| ۱۱ | ضیاء الدین اصلاحی | ۱۲۵-۷۸، ۳۱۵-۲۳۷، ۳۸۷-۳۴۸، ۴۲۳-۳۹۷، ۴۷۶ | ۱۸ | جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی، (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) | ۲۸۷ |
| ۱۲ | جناب عبدالرزاق صاحب قریشی بمبئی۔ | ۲۰۴ | | **شعراء** | |
| ۱۳ | عبدالسلام قدوائی ندوی | ۲ - ۵، ۱۶۲-۸۲ | ۱ | جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری | ۱۵۶ |
| | | | ۲ | جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی، (گورکھپور یونیورسٹی) | ۵۲ |
| ۱۴ | ڈاکٹر محمد سلمان عباسی صاحب (لکھنو یونیورسٹی) | ۱۲۲ | ۳ | جناب طفیل احمد مدنی الہ آباد | ۳۵ |
| ۱۵ | ڈاکٹر محمد طیب صدیقی سی ایم کالج دربھنگہ۔ | ۱۳۶ | ۴ | جناب عروج زیدی صاحب | ۲۳۶ |
| | | | ۵ | جناب محمود الرحمن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن | ۲۱۳ |
| ۱۶ | محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی | ۱۵۰ | | | |
| | رفیق دارالمصنفین | ۲۲۹ | ۶ | ڈاکٹر محمد ولی الحق لکھنو، | ۳۱۴ |



# فہرست مضامینِ معارف

جلد ۱۱۹

(بہ ترتیب حروف تہجی)

(جولائی ۱۹۷۶ء تا دسمبر ۱۹۷۶ء)

جلد ۱۱۸ ماہ جولائی ۱۹۷۶ء مطابق ماہ رجب المرجب ۱۳۹۶ھ عدد ۱

## مضامین



## مقالات



## وفیات

# شذرات

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے الجھے ہوئے مسائل سلجھتے جارہے ہیں شملہ کے معاہدہ نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی، خیال تھا کہ اُس کے بعد تعلقات کی بحالی اور استواری میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، لیکن رہ رہ کر کچھ ایسے حالات رونما ہوتے رہے، اور ایسی رکاوٹیں سامنے آتی رہیں کہ ایک مدت دراز امید و بیم کی حالت میں گزر گئی، اور ارتباط باہمی کے قیام میں تاخیر ہوتی رہی، لیکن موانع و مشکلات کے باوجود مصالحت و مفاہمت کے لئے کوششوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، آخر کار دشواریوں پر قابو حاصل کرلیا گیا، اور ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑنے لگے پچھلے دنوں حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے نمایندوں کی میٹنگ ہوئی اور طے پایا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات از سر نو قائم کئے جائیں، اور ہوائی جہازوں اور ریل گاڑیوں کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے، اس سمجھوتہ کے مطابق دونوں حکومتوں کی جانب سے سفیروں کی نامزدگی ہوگئی ہے سفارت خانوں کے کھولنے کے انتظامات ہو رہے ہیں، ریلوے لائن درست ہوگئی ہے اور ہوائی جہازوں کی پرواز کے انتظامات مکمل ہوگئے ہیں، امید ہے کہ جب تک معارف قارئین کے پاس پہونچے گا، اس وقت تک دونوں ملکوں کے درمیان آمدورفت شروع ہوچکی ہوگی، اور تعلقات پورے طور پر بحال ہوگئے ہوں گے اس طرح کئی برسوں کے بعد لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے آسانی کے ساتھ مل سکیں گے، اور تجارت کا سلسلہ شروع ہو جائےگا

...... ✼ ......

مولانا محمد عثمان فارقلیط سے معارف کے ناظرین بخوبی واقف ہیں، وہ پلکھنہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں بسر ہوا، وہیں مدرسہ علی جان میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی، وہ مذہباً اہل حدیث تھے، مگر مزاج میں بڑا اعتدال تھا حنفیوں کے ساتھ بڑا اختلاط تھا، اپنے اصول میں پختہ تھے، مگر تحزب اور گروہ بندی سے کوسوں دور تھے، دوسروں سے ایسی محبت اور یگانگت کے ساتھ پیش آتے کہ کسی کو غیریت کا احساس نہ ہوتا، وہ جماعتی عصبیت کے بجائے اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے تھے تعلیم کے زمانہ ہی سے مناظرہ سے دلچسپی تھی فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک یہی مشغلہ رہا اس سلسلہ میں دہلی کے علاوہ مدراس، کلکتہ، اور ملایا تک کے سفر کئے ۱۹۲۹ء میں الجمعیۃ (سہ روزہ) کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے، ہلال احمد زبیری صاحب کے بعد ادارت کی پوری ذمہ داری اُن کے سر آگئی درمیان میں مدینہ میں بھی کچھ عرصہ کام کیا، تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے الجمعیۃ بند ہوگیا تو لاہور چلے گئے اور ۱۹۴۷ء تک زمزم کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دہلی واپس آگئے، اور اسی سال دسمبر میں روزنامہ الجمعیۃ کا اجرا ہوا تو وہ اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے، اُن کے مضامین قوت استدلال، دلنشیں طرز تحریر اور موثر انداز بیان کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے تھے ۲۶ سال تک وہ برابر الجمعیۃ سے وابستہ رہے، ۱۹۷۳ء میں جب صحت نے بالکل جواب دیدیا، اور ضعف حد سے زیادہ ہوگیا تو مجبوراً اس خدمت سے سبکدوش ہوئے لیکن جمعیۃ علماء ہند سے اُن کا دلی تعلق برابر قائم رہا اور جمعیۃ بھی اُن کی خدمت رہی، الجمعیۃ کے علاوہ دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی کبھی لکھا کرتے تھے، لوگ اُن کی جرات و بے باکی، اور صداقت و حق گوئی، کی بڑی قدر کرتے تھے، گزشتہ سال اردو ایڈیٹرس کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو اسکی صدارت کیلئے انکا انتخاب کیا گیا انکا خطبہ صدارت بہت پسند کیا گیا افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ قوم و ملت کا یہ خدمتگزار دنیا سے رخصت ہوگیا، اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، اور اُن کے عزیزوں، دوستوں اور قدردانوں کو صبر کی توفیق اور اُن کے نقش قدم کو دلیل راہ بنانے کی ہمت عطا فرمائے،

حدیث کی کتابوں میں جامع ترمذی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہم سمجھی جاتی ہے اس میں ہوں تو زہد و رقاق اخلاق و آداب مناقب و تفسیر سبھی مضامین کی حدیثیں ہیں لیکن ان احادیث کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے جن کا تعلق فقہی ابواب سے ہے، امام ترمذی ائمۂ المجتہدین کا مسلک بیان کرتے ہیں اور وہ حدیثیں نقل کرتے ہیں جن سے وہ استدلال کرتے ہیں اس کے ساتھ راویوں کی حیثیت اور روایات کے صحت و سقم کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب حدیث کے درس میں داخل ہے اور بڑی توجہ کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، اسی بنا پر اس کی شرحیں بھی کافی لکھی گئی ہیں، قدیم شروح کے علاوہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی تشریحات، مولانا انور شاہ کشمیری کی تعلیقات اور مولانا عبد الرحمن مبارکپوری کی ضخیم شرح خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں لیکن ان کے باوجود اب بھی ایک ایسی جامع معتدل اور متوازن شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو طلبہ اور مدرسین دونوں کی ضروریات پوری کر سکے، یہ اہم کام مفتی عبد اللطیف صاحب رحمانی نے انجام دیا وہ مولانا لطف اللہ کے شاگرد اور مولانا محمد علی مونگیری کے مسترشد تھے، مدتوں حدیث و فقہ کا درس بھی دیا تھا، قدیم مدارس کے علاوہ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر بھی رہے، اس طرح اُن کی ذات میں بڑی جامعیت تھی، اُن کے اندر متقدمین کی باریک بینی، صوفی کی روشن ضمیری، مصنف کی وسعت نظر اور عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت پائی جاتی تھی، اس بنا پر اُن کی شرح میں بڑی جامعیت ہے۔ ان کے انتقال کے بعد اُن کے عزیز اور لائق شاگرد مولانا فضل اللہ صاحب شارح ادب المفرد نے مفتی صاحب کے تصحیح کردہ متن اور شرح پر نظر ثانی کی، اور حسب ضرورت اضافے کئے، ان اضافوں کے بعد یہ شرح اور مفید ہو گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ ایسی مفید کتاب اب تک طباعت سے محروم ہے، ملک میں عربی کتابوں کے پہلے جیسے ناشر اب نہیں رہے، مگر پھر بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ خدمت انجام دے کر نفع دارین حاصل کر سکتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ کوئی باہمت ناشر اس خدمت کے لئے تیار ہو جائیگا اور طالبان حدیث کو اس علمی ذخیرہ سے استفادہ کا موقع دیگا۔



# مقالات

## اسلام میں خالقِ کائنات کا تصور

از

عبد السلام قدوائی ندوی

انسان جب زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو طرح طرح کے مسائل و معاملات اس کے سامنے آتے ہیں جنھیں حل کرنا ضروری ہوتا ہے، اس موقع پر اسے زندگی کا نصب العین متعین کرنا پڑتا ہے، اور اس کی روشنی میں وہ طے کرتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے، اور کیا نہ کرنا چاہیے نصب العین کے ماتحت اسکے خیالات و افکار میں مرکزیت پیدا ہوتی ہے، اور ایک بنیادی تخیل دل کے اندر ایسا پیوست اور رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ کسی حال میں اس سے الگ نہیں ہوتا، یہی مرکزی خیالات یا عقائد زندگی میں اصل بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں جس طرح بنیاد کے بغیر کوئی عمارت نہیں بن سکتی ہے، اور جڑ کے بغیر کوئی درخت نشو و نما نہیں پا سکتا ہے، اسی طرح عقیدے کے بغیر کوئی عمل نہ برگ و بار لا سکتا ہے، نہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے، مقاصد سے انحراف اور اصول کی خلاف ورزی کے بعد خواہ کتنی ہی محنت اور جانفشانی سے کام کیا جائے۔ بے سود ہوگا، اگر مشرق تک پہونچنا مقصود ہے۔ تو مسافر کا رُخ بھی مشرق ہی کی طرف ہونا چاہیے، اگر اس نے مغرب کی طرف منھ کر لیا تو خواہ کتنی ہی تگ و دو کرے، اور منزل پر منزل طے کر ڈالے کبھی مشرق تک نہیں پہونچے گا۔

بلکہ جتنے قدم مغرب کی سمت اُٹھائے گا اسی قدر اپنی منزلِ مقصود سے دور ہوتا جائے گا، یہی حال اس عمل کا ہوگا جو عقیدہ کے مطابق نہ ہوگا، عمل کی صحت اور اسقم کا فیصلہ محنت اور جد و جہد کی کمی بیشی سے نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کہاں تک نیت اور عقیدہ کے مطابق ہے، اسی حقیقت کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

| | |
|---|---|
| انما الاعمال بالنیات و انما لامرئ | اعمال کا دار و مدار محض نیت پر ہے، اور |
| ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی دنیا | ایک شخص کے لئے وہی ہے جس کی اس نے |
| یصیبھا او الی امرأۃ ینکحھا فھجرتہ | نیت کی، یہاں تک کہ ہجرت (جیسا کار ثواب |
| الی ما ھاجر الیہ، | بھی) جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت |
| (صحیح بخاری آغاز جلد اول) | سے نکاح کرنے کے لئے کی، تو اس کی ہجرت |
| | اسی کام کے لئے سمجھی جائے گی جس کے |
| | لئے اُس نے ہجرت کی ہے، |

ایک اور روایت میں شہید کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، جس کے دل میں شجاعت اور ناموری کا خیال تھا، اس سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ تو نے میری راہ میں جان نہیں دی، تجھے بہادری اور نام آوری کی خواہش تھی، وہ دنیا میں مل چکی، اس کے بعد اس کے لئے دوزخ میں لیجانے کا حکم ہوگا،

قرآن مجید میں عقیدہ اور ایمان کے بغیر عمل کی لا حاصلی کو ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے،

| | |
|---|---|
| مثل الذین کفروا بربھم اعمالھم | ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب |
| کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم | کا انکار کیا یہ ہے کہ اُن کے اعمال اس راکھ |
| عاصف لا یقدرون مما کسبوا | کے مانند ہیں، جس پر ایک طوفانی دن |
| علی شیٔ ذٰلک ھو الضلال البعید | تیز ہوا چلی، انھوں نے جو کچھ کام کیا، |
| (سورۂ ابراھیم رکوع ۳) | اس میں سے کسی چیز پر وہ قدرت نہ |
| | رکھیں گے، یہ بڑی لمبی گمراہی ہے، |

ایک اور موقع پر اسی حقیقت کو اس طرح سمجھایا گیا ہے،

| | |
|---|---|
| والذین کفروا اعمالھم کسراب | اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے ان |
| بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتی | کے اعمال اس سراب کی طرح ہیں جو |
| اذا جاءہ لم یجدہ شیئاً | ایک چٹیل میدان میں ہے، پیاسا اسے |
| (نور - رکوع - ۵) | پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس |
| | کے پاس پہونچتا ہے، تو کچھ بھی نہیں پاتا، |

ایمان اور عقیدہ کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے، اعمال کے بامعنی اور نتیجہ خیز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے پیچھے دل کا یقین اور عمل کا خلوص ہو، یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس سے اربابِ دانش، اصحابِ فکر اور اہلِ مذاہب کسی کو انکار نہیں، سب کاروبارِ حیات کو بامقصد بنانا چاہتے ہیں، اور زندگی کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کے لئے سرے کی تلاش میں ہیں، اور اس عالم کی کثرت کو کسی وحدت میں سمونے کی خواہش رکھتے ہیں، اصطلاحات الگ الگ ہیں، راہیں بھی مختلف ہیں لیکن منزلِ مقصود سب کی ایک ہے، سب کا مطمحِ نظر یہی ہے کہ فتنہ و فساد، ظلم و جور اور حرص و ہویٰ کے طوفان سے انسانیت کے سفینہ کو ساحلِ مراد تک پہنچایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے کچھ اصول و ضوابط بنائے ہیں، اور ان کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں، اسلام نے ان کوششوں کا اعتراف کیا ہے، متفق علیہ باتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور جن امور میں اختلاف ہے ان میں افراط و تفریط سے بچ کر صراطِ مستقیم کی نشان دہی کی، اور

ایک ایسا نظامِ حیات پیش کیا جو نوعِ انسان کی دائمی فلاح و بہبود کا ضامن ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ان بنیادی عقائد کی تلقین کی، جو زندگی کا محور ہیں، اور جن کے بغیر حیاتِ انسانی کی کل سیدھی نہیں ہو سکتی،

**خالقِ کائنات**

ان ایمانی عقائد میں سب سے مقدم ایک ایسے ہمہ داں، ہمہ بیں اور ایک ہمہ گیر خدا کا اعتقاد ہے، جس کی ذات تمام عیوب سے مبرا اور ساری کمزوریوں سے پاک ہے جس کے اندر ہر قسم کے کمالات پائے جاتے ہیں، اور جو جلال و جمال اور قدرت و کمال کی تمام صفات سے متصف ہے، ایک ایسی ہستی کو تسلیم کر لینے کے بعد رازِ حیات کی پردہ کشائی آسان ہو جاتی ہے، اور زندگی کی گرہیں کھل جاتی ہیں، اور ہمارے ہاتھ میں وہ سرا آجاتا ہے، جس سے کائنات کی پیچیدہ گتھی سلجھائی جا سکتی ہے، اس کے بغیر وہم و گمان کے اندھیرے میں بھٹکنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں، قرآن مجید نے ایمان و یقین سے محروم اشخاص کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

| | |
|---|---|
| کظلمات فی بحر لجی یغشٰہ موج | (ان لوگوں کی مثال) ان تاریکیوں |
| من فوقہ موج من فوقہ سحاب | کی طرح ہے جو گہرے سمندر میں ہیں |
| ظلمات بعضھا فوق بعض اذا اخرج | (اس سمندر کو) ایک موج ڈھانپے ہو |
| یدہ لم یکد یرٰھا ومن لم یجعل | اس (موج) کے اوپر ایک اور موج |
| اللہ لہ نورًا فمالہ من نور، | ہو، اس کے اوپر بادل ہو، بعض |
| (سورہ نور رکوع ۵) | پر بعض، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے |
| | تو اس کو دیکھ نہ پائے، جس کو خدا |
| | نے روشنی نہیں دی، اس کے لئے |
| | کوئی روشنی نہیں، |



دنیا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کے اول و آخر کے بہت سے صفحات غائب ہیں، صرف درمیان کے چند اوراق ہمارے سامنے ہیں، ان میں مصنف کا نام بھی درج نہیں، ان موجودہ اوراق کو سامنے رکھکر اگلے اور پچھلے گم شدہ اوراق کے مضامین اور ان کے مصنف کا پتہ چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے، مگر حال کو دیکھ کر ماضی اور مستقبل کا صحیح صحیح پتہ لگا لینا آسان نہیں ہے، اس موقع پر راقم الحروف کو خود اپنا ایک واقعہ یاد آگیا، غالباً ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا مشہور مصری مفکر ڈاکٹر بہجت وہبی کی انجمن اسلام ہال بمبئی میں تقریر تھی، میں اس زمانہ میں روزنامہ خلافت کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا، تقریر سننے کے لئے گیا، اتفاق سے ذرا دیر میں پہنچا، تقریر کچھ ہو چکی تھی، اخبار کے لئے نوٹ لیتا رہا، لیکن نامکمل حالت میں اسے اخبار میں درج کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا، اور جو باتیں سنی تھیں، انہی پر قیاس کر کے شروع کا حصہ بھی مرتب کر دیا، صبح جب اخبارات شائع ہوئے تو تقریر کا آخری حصہ سب میں یکساں تھا، لیکن ابتدائی حصہ خلافت میں دوسرے اخبارات سے بالکل مختلف تھا چیف اڈیٹر نے وجہ پوچھی، تو میں نے سارا قصہ سنا دیا، وہ ہنسنے لگے، اور کہا تمھارا اندازہ کیا غلط نکلا، یہ بات تو آئی گئی ہو گئی مگر مجھے خیال ہوا کہ جب مقرر کی تقریر سُن کر اس کی روشنی میں اسی وقت اس کی گم شدہ کڑی ملانے میں اتنی بڑی غلطی ہوئی، تو کائنات کے تھوڑے سے حصہ کو دیکھکر اس کے آغاز و انجام کے اندازہ میں کس قدر غلطی ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے گمشدہ اوراق کے پتہ لگانے میں بڑی غلطیاں ہوئیں، بہتوں نے عاجز ہو کر کہہ دیا کہ ہم کچھ نہیں بتا سکتے کہ پہلے کیا تھا، اور بعد میں کیا ہوگا، کسی نے ناواقفیت کی بنا پر سرے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ اس عالم کی کتاب کا کوئی مصنف نہیں ہے، یہ کائنات خود بخود وجود میں آگئی، اور خود بخود چل رہی ہے لیکن

یہ خیال انسانی مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے، دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بغیر کسی بنانے والے کے نہ بنی ہے، نہ بغیر کسی چلانے والے کے چلی ہے، پھر یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ زمین آسمان، سورج، چاند، ستارے بغیر کسی بنانے والے کے بن گئے ہیں، تاریخ کے اوراق ہمارے سامنے کھلے ہیں، اس میں ایک مثال بھی ایسی نظر نہیں آتی، کہ کسی موجد کے بغیر کوئی شے وجود میں آگئی ہو، انسانی فطرت اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی، قرآن مجید نے اس حقیقت کو یوں سمجھایا ہے۔

| | |
|---|---|
| ام خلقوا من غیر شئ ام ھم | کیا وہ بغیر کسی شے کے خود بخود |
| الخالقون ام خلقوا السمٰوٰت | پیدا ہو گئے ہیں، یا وہ خود اپنے |
| والارض بل لا یوقنون، | خالق ہیں، یا انھوں نے آسمانوں |
| | اور زمین کو پیدا کیا ہے، (حقیقت |
| | یہ ہے کہ) وہ ایمان و یقین سے |
| (طور) | محروم ہیں؛ |

واقعہ یہ ہے کہ انسان نہ اپنا خالق ہے نہ کائنات کا، وہ تو خود قوانینِ قدرت کے اندر اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ اسے نہ اپنی زندگی پر اختیار ہے نہ موت پر، اس کی مجبوری و محتاجی قدم قدم پر نمایاں ہے وہ ہوا کا محتاج ہے، پانی کا محتاج ہے، غذا کا محتاج ہے، لباس کا محتاج ہے، الغرض سراپا احتیاج ہے، جو خود اپنا وجود بھی قائم نہ رکھ سکتا ہو وہ دوسروں کو کس طرح وجود میں لاسکتا ہے، اور کیسے ان کی پرورش کا سامان کرسکتا ہے، انسان کے علاوہ دنیا کی اور چیزوں پر نظر ڈالئے، عظیم الشان پہاڑ، لمبے چوڑے دریا، بلند و بالا ستارے، وسیع سیارے، سب انسان سے زیادہ مجبور نظر آتے ہیں، آدمی کو تو کچھ اختیار بھی حاصل ہے، مگر یہ مقررہ نظام سے سرمو انحراف



نہیں کرسکتے، سورج اور چاند کے طلوع و غروب کے ضابطے مقرر ہیں، زمین بے چون و چرا گردش کر رہی ہے، پہاڑ اور دریا اپنے کام میں لگے ہیں، غور سے دیکھئے، یہ کارخانۂ عالم صرف بنا کر کھڑا ہی نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ چل بھی رہا ہے، اور بڑے مرتب اور منظم طریقے سے! آخر کوئی تو اس کا چلانے والا ہونا چاہئے، جب کوئی معمولی گاڑی بھی کسی ہوشیار ڈرائیور کے بغیر نہیں چل سکتی، تو زمین و آسمان کی یہ عظیم الشان گاڑی بغیر کسی علیم و قدیر ہستی کے کیونکر چل سکتی ہے۔

کائنات پر جب ہم غور کرتے ہیں، تو اس کی ہر چیز میں اعلیٰ درجہ کی صناعی اور غیر معمولی باریک بینی نظر آتی ہے، اشیاء کی تخلیق اور نشو و نما ایک اٹل اور مستحکم ضابطہ کے ماتحت ہے، اور انحطاط و ارتقا، اور فنا و بقا کا ایک ہمہ گیر قاعدہ ہر موقع پر عمل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، انسان خود اپنی ذات پر غور کرے، تو اسے یہاں بھی اصول و قوانین کی منظم کارفرمائی نظر آئے گی، اس کے اندر کی مشین اس باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہی ہے کہ اگر ایک رگ بھی اپنا کام بند کردے، یا قاعدہ کی پوری پابندی نہ کرے تو جسم امراض و آلام کی آماجگاہ بن جائے، کیا یہ مشاہدہ ہمیں خالقِ کائنات اور مدبرِ عالم کے اعتراف پر مجبور نہیں کرتا اور کیا اس کے بعد بھی ہمارا ضمیر یہ نہیں کہتا کہ اس عالم کا بنانے اور چلانے والا بے انتہا طاقت و اقتدار، علم و اختیار، اور فکر و تدبیر کا مالک ہے، اور اس کے اندر تخلیق و تحسین اور اصلاح و تعمیر کی غیر معمولی قدرت ہے، اُس نے یہ کارخانۂ عالم بڑی نفاست اور دقتِ نظری کے ساتھ بنایا، اور بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسے چلا رہا ہے، اس کا ہر قاعدہ مستحکم اور ہر اصول اٹل ہے، دنیا کا ذرہ ذرہ اس کی قدرت و حکمت، علم و نظر اور عقل و بصیرت کا شاہد ہے، فلسفہ کی اصطلاح میں یہی تخلیقِ عالم کا باعث اولین اور علت العلل ہے، اور مذہب کی زبان میں اسی کو خدا

یا اللہ کہتے ہیں،

یہ سچ ہے کہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا ہے لیکن اس سے اس کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، کسی چیز کے نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود نہیں ہے، ہوا کو ہم کہاں دیکھتے ہیں! لیکن اس کی موجودگی سے کون انکار کر سکتا ہے، قوت کس کو نظر آتی ہے، جسم کا درد کون دیکھ سکتا ہے؟ لیکن نہ دیکھ سکنے کے باوجود، سے تسلیم کرنا پڑتا ہے، اور اثرات و علامات اس کا پتہ دیتے ہیں، اسی طرح خدا گو ہمیں نظر نہیں آتا ہے، اور ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہے، مگر کائنات کی ہر شے اس کے وجود کی شہادت دے رہی ہے، مخلوق خالق کا پتہ دیتی ہے، اور وجود موجد کا یقین دلاتا ہے، اس حقیقت کو قرآن مجید نے فلسفہ کی دقیق اصطلاحات کے بجائے عام فہم انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بات دلوں کے اندر اتر جاتی ہے، اور خواص و عوام یکساں اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس نے بتایا کہ خالقِ کائنات اور مدبّرِ عالم کے وجود میں کوئی شبہ نہیں ہے، مادی آنکھیں اس کے دیدار کی طاقت نہیں رکھتی ہیں، لیکن اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو آسمان سے زمین تک ہر چیز اس کے وجود کا اعلان کر رہی ہے،

انّ فی خلق السّمٰوٰتِ و
الارض و اختلاف اللیل و
النھار لآیات لاولی الالباب۔
(آل عمران رکوع ۲۰)

آسمانوں اور زمین کی تخلیق، اور شب و روز کے الٹ پھیر میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں،

جانوروں پر غور کرے تو ان کے حالات بھی قدرتِ خداوندی کا پتہ دیتے ہیں،

وانّ لکم فی الانعام لعبرۃ
نسقیکم من بطونھا من بین

اور تمہارے لئے جانوروں کے اندر سامان عبرت ہے، ہم ان کے پیٹوں



فرث و دم لبنًا خالصًا سائغًا
للشّٰربین،
(نحل۔ رکوع۔ ۹)

سے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے،

آسمان کی طرف کوئی نگاہ اٹھائے اور چمکتے ہوئے سورج اور نورانی چاند پر نظر ڈالے تو اسے قدرت و تدبیرِ الٰہی کا ایسا جلوہ نظر آئے، کہ بے ساختہ پکار اٹھے۔

تبارکَ الّذی جعلَ فی السّماءِ
برُوجًا وجعَل فیھا سِراجا
وقمرًا منیرًا،
(فرقان۔ رکوع۔۶)

بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان کے اندر چراغ (سورج) اور روشنی دینے والا چاند بنایا،

وہ زمین کی حالت پر غور کرے کہ اس کے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ہیں، اور کتنے ذخائر پوشیدہ ہیں، نیز اپنی ذات پر غور کرے، اور نفس کی قوتوں کا جائزہ لے، تو خلاقِ عالم کی بے نہایت قدرت کا یقین ہو جائے،

وفی الارض آیات للموقنینْ
وَفی انفسکمْ افلاتبصرُوْنَ؟
(ذاریات رکوع۔۱)

یقین کرنے والوں کے لئے زمین کے اندر نشانیاں ہیں، اور تمہارے نفوس کے اندر بھی قدرتِ خداوندی کی نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو،

کارخانۂ عالم پر نظر ڈالنے سے نہ کوئی نقص نظر آتا ہے، نہ کہیں بے قاعدگی محسوس ہوتی ہے،

مَاترٰی فی خلقِ الرّحمٰن منْ

تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں

تفاوت فارجع البصر هل
ترى من فطور ثم ارجع البصر
كرتين ينقلب اليك البصر
خاسئًا وهو حسير،

(ملک - رکوع ۱)

دیکھو گے نگاہ دوڑاؤ کیا تم کوئی فطور
دیکھتے ہو، پھر دو بار پلٹ کر نگاہ ڈالو
نگاہ تمہارے پاس پلٹ کر اور تھک کر
واپس آجائے گی،

کائنات کی جس چیز پر غور کروگے، اس کی تخلیق میں عجیب وغریب صناعی اور استحکام نظر آئے گا، اور زبان سے بے اختیار نکلے گا،

صنع الله الّذی اتقن كل شیٔ (نحل ۷)

اللہ کی کاریگری ہے، جس نے ہر چیز کو بڑی مہارت اور استحکام کے ساتھ بنایا ہے،

قرآن مجید میں اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں مشاہدۂ کائنات کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور عالم کے ان حیرت انگیز جلووں کو دکھا کر پوچھا گیا ہے کہ

افی الله شک فاطر السمٰوٰتِ
والارض، (نحل ۷)

کیا خدا کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمان اور زمین کا بنانے والا ہے،

توحید | اس میں کوئی شک نہیں کہ جو بھی اس کائنات پر غور کرے گا وہ اس کے موجد وخالق کے اعتراف پر مجبور ہوگا، ناممکن ہے کہ یہ کارخانۂ عالم اس نظم وضبط اور اس خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ بغیر کسی علیم وبصیر اور حکیم وقدیر کی نگرانی کے چل رہا ہو، اس اعتراف کے ساتھ اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا اس کائنات کا مالک ہے، اسی نے اسے بنایا ہے، اور وہی اسے چلا رہا ہے،



الا له الخلق والامر،
(اعراف ۵۳)

خوب سمجھ لو کہ تخلیق بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے، اور حکمرانی بھی اسی کی ہے،

الله لا اله الا هو الحی القیوم لا
تاخذه سنة ولا نوم له
ما فی السمٰوٰت وما فی الارض،
(بقرہ ۳۴)

اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ ہمیشہ زندہ ہے اور سارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہے، اُسے نہ اونگھ آتی ہے، نہ نیند، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اسی کی ملک ہے،

وله اسلم من فی السمٰوٰت
والارض، (آل عمران ۹)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کے سامنے سرنگوں ہے،

له ملك السمٰوٰت والارض
والى الله ترجع الامور،
(حدید ۱)

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، اور اللہ ہی کی ذات تمام معاملات کا مرجع ہے،

تبارك الّذی بیده الملك
وهو على كل شیٔ قدير
(ملک ۱)

بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں فرماں روائی ہے، اور ہر چیز پر قادر ہے،

سارا نظام عالم خدا کی یکتائی کی گواہی دے رہا ہے، زمین سے آسمان تک جدھر نظر ڈالو ایک باقاعدگی نظر آئے گی کہیں بھی قاعدہ وضابطہ سے سرمو انحراف محسوس نہ ہوگا،

سورج پابندی کے ساتھ ایک مقررہ وقت پر نکلتا ہے، ڈوبتا ہے، جس مقام پر طلوع و غروب کا جو وقت ہے، ہزاروں سال میں بھی اس میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں ہوتا، چاند کی گردش کا ایک پختہ اصول ہے، ایک باریک ٹیڑھی لکیر سے رفتہ رفتہ بڑھ کر پورا گول ہو جاتا ہے، پھر کم ہوتے ہوتے اسی طرح ایک منحنی لکیر بن جاتا ہے،

والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم (سورۂ یٰسین - ۳۹)

اور چاند کی ہم نے منزلیں متعین کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ لوٹ کر پھر ایک پرانی پتلی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے،

ہلالِ نو ۲۹ یا ۳۰ کو ہر شام دکھائی دیتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ۲۸ کو نظر آجائے یا ۳۱ تک مؤخر ہو جائے، بے شمار ستارے اور سیارے فضائے لامتناہی میں رواں دواں ہیں، لیکن کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں سب اپنے اپنے دائرے کے اندر ہی چکر لگاتے رہتے ہیں،

کل فی فلک یَسبحُون ہ (یٰسین)

سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں،

لاالشمس ینبغی لھا اَنْ تدرک القمر ولا الیل سابق النھار ہ (یٰسین)

سورج کو حق نہیں پہنچتا کہ چاند کو پالے، نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے،

الشمس تجری لمستقر لَّھا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم (یٰسین)

سورج اپنے مستقر پر چلتا رہتا ہے، یہ غالب اور علم والی ذات کا اندازہ ہے،

دیکھو کس طرح دن سے رات اور رات سے دن نمودار ہوتا ہے، اور ہر ایک کا ایک حساب ہے جس سے سرِمو تجاوز نہیں کر سکتا، روشنی کی رفتار اور ہے اور آواز کی اور ہے، موسم کیسی ترتیب کے ساتھ



آتے ہیں، جس علاقے میں جو وقت اور کیفیت ہے، صدیوں سے وہی حال ہے، ہوائیں کیسے اصول کے مطابق چل رہی ہیں، بارش کے کیسے ضابطے مقرر ہیں، پودے کس طرح اُگتے اور بڑھتے ہیں، اور کس طرح برگ و بار لاتے ہیں، جانوروں اور آدمیوں کے توالد و تناسل کا کیسا باقاعدہ انتظام ہے، انسانی جسم کے اندر ہر عضو کس طرح اپنے کام میں لگا ہوا ہے، دماغ کا دائرۂ کار الگ ہے، دل کا الگ، معدہ اپنا کام کر رہا ہے جگر اپنا، کوئی کسی کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا، جس قدر باریکی سے غور کروگے، خدا کی عظمت و قدرت اور علم و حکمت دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاؤگے، اصول و قواعد کی باقاعدگی ہمیں اس یقین پر مجبور کرتی ہے کہ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہ (قتال ۳)

اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے،

وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہ (جاثیہ ۴)

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی عظمت و کبریائی ہے،

وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے،

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ ہ (اعراف ۷)

تخلیق اور حکمرانی سب اسی کی ہیں، ساری کائنات اس کی مطیع و فرمانبردار ہے،

واذا قضٰی امرًا فانّما یقول لہٗ کُنْ فیکُوْن (مومن ۷)

وہ جو چاہتا ہے چشم زدن میں ہو جاتا ہے،

اللہ نورُ السّمٰوٰت والارض، (نور ۵) آسمان و زمین اسی کے نور سے منور ہیں،

نظامِ عالم کی یکتائی خلاّقِ عالم کی یکتائی کی شہادت دے رہی ہے، اگر اس کائنات کے کئی مالک ہوتے، تو دنیا کی یہ باقاعدگی، اور ہم آہنگی باقی نہیں رہتی، ہر ایک اپنا حکم چلاتا تو سارا عالم

زیر و زبر ہو جاتا، قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے،

| | |
|---|---|
| لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ | اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا |
| لفسدتا فسبحان اللہ رب | اور معبود ہوتے تو وہ دونوں بگڑ کر |
| العرش عما یصفون، | رہ جاتے، پس اللہ رب العزت |
| (انبیاء - ع - ۲) | ان تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں، |

جس طرح ایک ادارے کے کئی یکساں اختیار رکھنے والے ناظم، کسی کارخانے کے کئی منیجر اور کسی ملک کے کئی بادشاہ نہیں ہو سکتے، اسی طرح اس دنیا کے کئی مالک نہیں ہو سکتے، اسی لئے قرآن مجید خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کو ثابت کرنے کے ساتھ شرک کی نفی پر بھی زور دیتا ہے، اس نے شرک کی تمام راہیں مسدود کر دیں، یہاں تک کہ روزمرہ نماز کے اندر تشہد میں اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے ساتھ وَحْدَہٗ (وہ اکیلا ہے) اور اسکے بعد لاشریک لہٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) کا اضافہ کر دیا گیا، حج کے موقع پر اللّٰھُمَّ لبیک کے ساتھ لاشریک لک کا اعلان بھی ضروری قرار دیا، تاکہ ذہن شرک کے خیال سے پاک رہے، اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے اقرار کے بعد بھی بہت سے لوگ شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بعض خیر و شر کی کشمکش دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا نیکی اور بدی کی قوتوں کے درمیان تقسیم ہے، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خیر و شر کا وجود اضافی ہے، نیکی بدی کے فیصلے کا انحصار استعمال پر ہے کسی کو بے گناہ مارا جائے، تو یہ شر ہے، لیکن کسی مجرم کو سزا دی جائے تو خیر ہے، بے سبب کسی کا سامان چھین لیا جائے تو یہ ڈاکہ ہے، لیکن کسی محتکر (ہورڈر) کا سامان چھین کر ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو یہ کار ثواب ہے، امن پسند شہریوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے



تو یہ ظلم ہے، لیکن باغیوں اور قاتلوں کے ساتھ یہی سلوک مقتضائے عدل ہے، الغرض خیر و شر کسی شے یا عمل میں نہیں ہے، بلکہ انسان کی نیت اور موقع و محل کے اعتبار سے کام محمود و مذموم بن جاتے ہیں،

بعض لوگ شئون و احوال کی نیرنگیوں میں یکرنگی کو محسوس نہ کر سکے، اور ہر جلوے کو ایک نئے خدا کی تجلی سمجھے اور ایک معبود کی جگہ سینکڑوں معبودوں کے سامنے سر جھکانے لگے، شرک کی اس کے علاوہ بھی بہت سی صورتیں ہیں، بہت سے لوگ خدا کو دنیاوی بادشاہوں کی طرح سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس طرح بادشاہ کو کاروبار سلطنت کے لئے وزیروں اور معاونوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح خدا نے بھی اپنے وزیر اور مشیر مقرر کر رکھے ہیں لیکن ان کا یہ اندازہ صحیح نہیں ہے،

| | |
|---|---|
| ماقدروا اللہ حق قدرہ | انھوں نے اللہ کا صحیح اندازہ |
| (الغاھر (۱۱)) | نہیں لگایا، |

بادشاہ کی قوت محدود اور علم ناقص ہوتا ہے، لیکن خدا کی قوت لامحدود ہے، ہر چیز اس کی نظر میں ہے، وہ علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے، ہر چیز کی فرماں روائی اس کے ہاتھ میں ہے،

| | |
|---|---|
| بیدہٖ ملکوت کل شیءٍ (یٰس ۵) | اسی کے دست قدرت میں ہر چیز ہے، |
| وللہ مافی السمٰوٰت والارض | اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے |
| (نحل ۷) | سب اسی کے تابع فرمان ہے، |

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اللہ کے بعض نیک بندے اس کی بارگاہ میں ایسا تقرب رکھتے ہیں، کہ خدا ان کی سفارش ٹال نہیں سکتا، اسی لئے خدا کے ساتھ ان کی بندگی بھی

ضروری سمجھتے ہیں، سکتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ما نعبدھم الا لیقربونا الی | ہم ان کو خدا نہیں سمجھتے لیکن ان |
| اللہ زلفی، | کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ |
| (زمر-ع-۳) | وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں |

یہ ان کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح نجات حاصل کر لیں گے لیکن اللہ فرماتا ہے، شفاعت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، للہ الشفاعۃ جمیعا (زمر) اُن کے معبودان باطل اور خود تراشیدہ بت کیا سفارش کریں گے، سفارش تو فرشتے اور پیغمبران برحق بھی اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتے ہیں، مَنْ ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ وہ اس کی اجازت کے بغیر بات بھی نہیں کر سکتے، لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن (سورۂ نبا) خدا کے کتنے ہی مقبول بندے ہوں، بہرحال بندے ہیں بڑے بڑے پیغمبر اپنی بندگی کا اعتراف کرتے ہیں، حضرت مسیحؑ کے سلسلے میں فرمایا،

| | |
|---|---|
| لن یستنکف المسیح ان یکون | مقرب فرشتے اور حضرت مسیحؑ خدا کی |
| عبد اللہ ولا الملئکۃ المقربون (نساء ۲۴) | بندگی میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، |

خود سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ

| | |
|---|---|
| قُلْ انما انا بشرٌ مثلکُمْ یوحیٰ | کہہ دیں میں تمہارا جیسا آدمی ہوں، ہاں |
| اِلیّ، (کہف-ع-۱۲) | میری طرف وحی کی جاتی ہے، |

اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنے کے لئے نمازوں میں تشہد کے موقع پر رسالت سے پہلے عبدیت کا اقرار کرایا گیا، اور کہلایا گیا اشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ،

یہ سارا انتظام اس لئے کیا گیا تاکہ آپؐ کی رسالت میں کوئی الوہیت کا رنگ نہ بھر سکے، اور



گزشتہ زمانوں کی طرح نبوت میں خدائی شان نہ پیدا کی جا سکے، حضرت مسیحؑ کی طرح نہ کوئی خدا کا بیٹا کہا جا سکے، اور نہ بنی اسرائیل کی طرح کوئی،

نحنُ ابناء اللہ واحباءہٗ (مائدہ-۳) ہم خدا کے بیٹے اور اسکے چہیتے ہیں)

کا نعرہ لگا سکے، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارہ میں اتنی فکر تھی کہ بار بار اپنی بشریت کا اعلان فرماتے تھے، کہ میں عبداللہ کا بیٹا محمد خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں[1]، آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا، کہ کوئی آپ کو سید (آقا) کہے، فرماتے تھے سید تو اللہ ہے[2]، خدا کے سامنے بار بار اپنی عاجزی اور بے چارگی کا اظہار فرماتے تھے، عزیزوں اور اہل خاندان سے خاص طور پر فرماتے تھے، کہ میں خدا کے یہاں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا[3]، آپ معصوم تھے، اللہ کی طرف سے رحمت و مغفرت کا وعدہ بھی تھا، مگر بایں ہمہ احساس بندگی کا یہ حال تھا کہ فرمایا کہ کوئی اپنے اعمال کے بھروسہ پر جنت نہیں جا سکتا ہے، جب تک کہ خدا کی رحمت دستگیری نہ کرے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا آپ بھی یا رسول اللہ، فرمایا ہاں میں بھی، سوائے اس کے کہ اللہ اپنی رحمت سے ڈھانپ لے[4]، آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک بار کسی شادی کے موقع پر بچیاں گا رہی تھیں، اس کے دوران ان کی زبان سے نکلا:-

| | |
|---|---|
| وفینا رسُول یعلم ما فی | ہمارے درمیان ایک ایسا رسول ہے جو |
| غدٍ ہ | کچھ کل پیش آنے والا ہے اُسے |
| | جانتا ہے، |

آپ نے فوراً انھیں ٹوکا اور فرمایا یہ نہ کہو[5]، وحی الٰہی نے بھی اعلان کیا کہ

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ [2] ابو داؤد، کتاب الادب و ادب المفرد امام بخاری باب ھل یقول سیدی، [3] تفسیر وانذر عشیرتک الاقربین، [4] صحیح مسلم [5] صحیح بخاری کتاب النکاح،

قُل لَّا اَقُولُ لَکُمْ عِندِی خزائن
اللہ وَلَا اَعْلَمُ الغیب ٥
(انعام - ۵)

کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ
میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں،
اور میں غیب نہیں جانتا ہوں،

وَعِندَہٗ مَفَاتِحُ الغَیبِ لَا
یَعلَمُھَا اِلَّا ھُوَ،
(انعام - ۷)

اور غیب کی کنجیاں اسی (اللہ)
کے پاس ہیں، اس کے سوا انھیں
اور کوئی نہیں جانتا ہے،

انکسار و احتیاط کی حد یہ ہے کہ آپ نے اپنی جو مہر بنوائی تھی، اس میں اپنا نام سب سے نیچے رکھا تھا، اس کے اوپر رسول، اور سب سے اوپر اللہ، گویا یہ اس کا اظہار تھا کہ مجھے جو کچھ شرف حاصل ہوا ہے، وہ رسالت کی وجہ سے ہے، اور رسالت اللہ کی دین ہے،

وَاللہُ یَختَصُّ بِرَحمَتِہٖ مَن
یَشَاءُ (آل عمران)

اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت
کے لئے خاص کر لیتا ہے،

اَللہُ اَعلَمُ حَیثُ یَجعَلُ رِسَالَتَہٗ
(انعام)

اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت
سے کس کو سرفراز کرے،

**ذات وصفات** اوپر کی سطور میں خدا کے وجود، اور اس کی توحید کا ذکر ہو چکا ہے، انسان کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے، کہ دنیا کی یہ ساری چہل پہل ایک بالادست ہستی کی رہینِ منت ہے، ہماری نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں لیکن ہمارا دل اس کے وجود کی شہادت دیتا ہے، صانعِ عالم کا اعتراف ہمارے وجدان کا تقاضا اور ہماری فطرت کی پکار ہے،

فِطرَتَ اللہِ الَّتِی فَطَرَ النَّاسَ
عَلَیھَا لَا تَبدِیلَ لِخَلقِ اللہِ
ذٰلِکَ الدِّینُ القَیِّمُ وَلٰکِنَّ
اَکثَرَ النَّاسِ لَا یَعلَمُونَ،
(نحل)

یہی اللہ کی وہ فطرت (بناوٹ) ہے
جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے، اللہ
کی بناوٹ میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا،
یہی صحیح دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں
جانتے ہیں،



لیکن اس نادیدہ ہستی کا تصور کس طرح کیا جائے جو برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ہے؟ جو جمال آرائی و جلوہ نمائی کے باوجود مستور ہے[1]

انسان کی پرواز خیال اس تک پہونچنے سے قاصر ہے، مگر اپنی بے بسی اور بیچارگی کے باوجود اسے آرزوئے دید ہے، اس کو اپنے بازوؤں کی سستی اور کمند فکر کی کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن پھر بھی اس بام بلند تک رسائی کی تمنا سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے، اس کا یہ جذبہ منشائے فطرت کے موافق اور مقصد تخلیق کے مطابق ہے، انسان کو خدا نے اپنا نائب (خلیفہ) مقرر کیا ہے، پھر اگر اسے آقا کے دیدار کی تمنا اور مالک سے ملاقات کی آرزو ہے، تو کیا بیجا ہے؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسانی نگاہیں اس مستورِ ازل کے جلوے کی تاب نہیں رکھتیں (لا تدرکہ الابصار (سورۂ انعام) عام انسانوں کا کیا ذکر ہے، پیغمبران اولوالعزم بھی اس کی ایک جھلک نہ دیکھ سکے، حضرت موسیٰ کا قصہ اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے بالواسطہ تجلی کی بھی تاب نہ لا سکے اور بیہوش ہو کر گر پڑے، اور پہاڑ چور چور ہو گیا[2]

پھر جب پیغمبروں کا یہ حال ہے تو دوسرے آدمیوں کی کیا بساط ہے کہ نظر ڈال سکیں وہ

---

[1] آسی غازی پوری نے کیا خوب کہا ہے،

بے حجابی کا یہ عالم ہے کہ ہر شے سے ہے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

[2] حضرت موسیٰ کا پورا واقعہ سورۂ اعراف میں ہے،

ہمارے دل کے قریں اور ہماری شہرگ سے بھی قریب ہے، اس کی تشریف فرمائی دشوار نہیں ہے، اپنے ہی حوصلہ کی تنگی اور اپنی ہی نظر کی کوتاہی مانع نظارہ ہے، اس لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ دیدارِ ذات کے بجائے تصورِ صفات پر اکتفا کی جائے، گو بے چون و چگوں ہستی کی صفات کا تعین بھی مشکل ہے، انسان کے بس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں، کہ تمام صفاتِ حسنہ اس سے وابستہ کردے، وہ خالق و رازق ہے، وہ ربِ کریم ہے، وہ علیم و بصیر ہے، وہ رحمٰن و رحیم ہے لیکن اس کے ساتھ وہ صاحبِ عظمت و جلال ہے، اس کی گرفت شدید اور اس کا انصاف بے لاگ ہے، وہ حاکم و غالب ہے،

قرآن مجید میں بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا ہے، کہ اسکی صفات لامحدود ہیں،

| | |
|---|---|
| ولوان مافی الارض من | اگر زمین کے سارے درخت قلم |
| شجرۃ اقلام والبحر یمدہ | بن جائیں اور ایک سمندر کے علاوہ |
| سبعۃ ابحر مانفدت کلمٰتِ | سات اور سمندر سیاہی بن جائیں، |
| اللہ، | تب بھی اللہ کی باتیں کبھی ختم نہ |
| (کہف رکوع - ۱۲) | ہوں گی، |

اس لئے خدا کی بہت سی صفات بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ سارے اچھے نام اس کے ہیں،

| | |
|---|---|
| اللہ لا الٰہ الا ھُوَ لہُ الاسماء | اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، |
| الحسنیٰ ہ (طٰہٰ - رکوع ۱۳) | تمام اچھے نام اسی کے ہیں، |

اس طرح قرآن مجید نے اللہ کے ساتھ ربط و تعلق کی ایک راہ نکال دی تاکہ انسان کی



بے چین روح کی تسکین کا سامان ہو جائے، عشق و شیفتگی کے لئے حسن و جمال کا مرقع سامنے آجائے، جبینِ عقیدت کو اظہارِ نیاز کے لئے آستانۂ عظمت و کمال نظر آئے، اور جذبۂ عبودیت کو عرضِ حال کے لئے پیرایۂ بیان نصیب ہو لیکن ان صفات کے بیان میں اس کا خاص خیال رکھا گیا، کہ ایسے الفاظ نہ استعمال کئے جائیں جن سے ذاتِ باری مخلوق کے مشابہ ہو جائے، اسی بنا پر ماں، باپ، بیٹا اور بھائی وغیرہ کے الفاظ سے اجتناب کیا گیا، کیونکہ اس سے خدا کی عظمت میں کمی آتی، اور ذہن مادی رشتوں میں الجھ کر حقیقت سے دور ہو جاتا، تصحیح خیال کے لئے متفرق آیتوں کے علاوہ ایک پوری سورہ نازل فرمائی،

| | |
|---|---|
| قُل ھُوَاللہُ اَحَدٌ اللہُ الصَّمَدُ لَم | کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز |
| یَلِدْ وَلَمْ یُولَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا | ہے، نہ وہ باپ ہے نہ بیٹا، اس کے برابر |
| اَحَدٌ ہ (سورہ اخلاص) | کا کوئی نہیں ہے، |

لوگوں کو تاکید کی کہ تم اس کے لئے مثالیں نہ گڑھو، فلا تضربوا للہ الامثال (سورہ نحل) اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے، لیس کمثلہ شیٔ (سورۂ شوریٰ)

اس طرح تشبہ اور تجسم کی تمام راہیں بند کر دیں لیکن اس کے باوجود ذات و صفات کو ایسے دلآویز طریقہ سے بیان کیا کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتے ہیں، اور روح اس کے عشق میں سرشار ہو جاتی ہے، اور انسان والہانہ عقیدت کے ساتھ آقا کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، اس کے سامنے ایک بلند نصب العین ہوتا ہے، جو اگرچہ اس کی دسترس سے دور ہوتا ہے لیکن سمندِ شوق کے لئے ہمیشہ مہمیز کا کام دیتا ہے، وہ اپنے اندر صفاتِ الٰہی کی جھلک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، تاکہ تخلقوا باخلاق اللہ کا مظاہرہ ہو اور چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے رنگ میں رنگ دے، وہ پکار اٹھتا ہے،

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ، (بقرہ ۔) — ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا، اور اللہ سے بڑھ کر کس کا رنگ چوکھا ہے،

لیکن یہ تلقین اس خوبی سے کی گئی کہ عبد و معبود کی حدیں قائم رہیں، اور ذات کے ساتھ صفات میں بھی شرک کی گنجایش نہیں رہی، خدا کی صفات اصل اور انسانی اوصاف نقل ہیں، خدا کی صفات حقیقت اور انسانی صفات مجازی شکل میں ہیں، مثلاً انسان کے اندر بھی رحم پایا جاتا ہے، مگر خدا کی رحمت سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے، وہ بھی پرورش کا کام کرتا ہے مگر خدا کی ربوبیت کی شان ہی اور ہے، وہ بھی دوسروں کو عطا کرتا ہے مگر اس کا خزانہ خدا ہی کے یہاں ہے، وہ اس سے لے کر دوسروں کو پہنچاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

انا قاسم واللہ یعطی، — میں تقسیم کرنے والا ہوں دیتا اللہ ہے،

جس طرح اللہ کی ذات میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح اس کی صفات میں بھی کسی کی شرکت جائز نہیں ہے، اگر کسی کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال آجائے کہ رزق کوئی دوسرا دیتا ہے، نفع نقصان کسی اور کے ہاتھ میں ہے، دعائیں کوئی دوسرا قبول کرتا ہے، تو یہ عقیدہ شرک سمجھا جائے گا، خدا کی ذات اور صفات دونوں شرکت سے مبرا ہیں اسلام کی توحید درمیانی وسائط کی بھی متحمل نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے "مجھے پکارو میں تمھاری درخواست قبول کروں گا (ادعونی استجب لکم - سورہ مومن) میں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں، پس چاہئے کہ مجھ سے مانگیں اور مجھی پر یقین رکھیں (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی والیومنوا بی - بقرہ) اس لئے ہم ہر نماز میں اقرار کرتے ہیں کہ

ایاک نعبد وایاک نستعین، — خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں،



کتاب و سنت میں ان امور کے بارہ میں ایسی صفائی اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے کہ کسی کے لئے ظاہر پر باطن کا پردہ ڈالنے کی گنجایش نہیں رہ گئی، حالانکہ ذات وصفات کے مسائل بہت نازک ہیں، اسلام سے پہلے ان مباحث نے بہتوں کو ڈگمگا دیا، کسی نے ذات کے تجرد پر اتنا زور دیا کہ صفات کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا، کسی نے صفات کی اہمیت اتنی بڑھا دی کہ ہر صفت نے ایک خدا کا روپ اختیار کیا، اور شرک و بت پرستی کے دروازے کھل گئے، لیکن اسلام نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کیا کہ ذات الٰہی کے ساتھ والہانہ تعلق کی راہ نکل آئی لیکن تجسم کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی، صفات نے بندوں کے لئے مالک سے ربط و شیفتگی کی راہیں کھول دیں، مگر نہ شرک کو سر اٹھانے کا موقع ملا، نہ صورت گری کی گنجایش باقی رہی، نہ عوام و خواص کے لئے عقائد کے الگ الگ خانے بننے پائے، عالم و جاہل، خواص و عوام سب کے لئے ایمان باللہ کی ایک ہی صورت ہے، ایمان اپنی کمیت میں ناقابل تقسیم ہے، البتہ مجاہدہ اور حسن عمل سے اس کی کیفیت میں اضافہ و ارتقاء ہو سکتا ہے، اور جو بار بتا ہے علما و حکما دلائل و براہین کے ذریعہ اپنے یقین کو مزید مستحکم کر سکتے ہیں، اور اصحاب سلوک و طریقت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اپنے ایمان کو جلا دے سکتے ہیں، اسلام نے کسی کے لئے ترقی کی راہ بند نہیں کی ہے، جو جتنا آگے بڑھنا چاہے بڑھ سکتا ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا لیکن فلاسفہ و متکلمین کے دلائل ہوں یا اصحاب طریقت کے کشف کسی کو کتاب و سنت کی تصریحات سے تجاوز کی اجازت نہیں ہے، دلائل و مشاہدات پر انسانی افکار و خیالات اور جذبات و میلانات کا اثر پڑتا ہے، نہ عقل آزاد ہوتی ہے نہ کشف، ہماری تاریخ عقل و کشف کی غلطیوں کے واقعات سے پر ہے، اس لئے ان ذرائع کو یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے، ایمان و یقین کا سزاوار وہی علم ہے جو وحی الٰہی سے حاصل ہوا ہو اور لسان نبوت نے جس نے تصدیق کی ہو،

# شیخ بوعلی سینا اور اسکے علمی کارنامے

از جناب ڈاکٹر شفقت اعظمی صاحب لٹریری ریسرچ یونٹ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ فلسفہ و حکمت کی تاریخ کا عہد زریں قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ ابونصر فارابی، ابن مسکویہ، ابوزکریا رازی، ابن ہیثم، امام غزالی، ابوریحان البیرونی اور شیخ بوعلی سینا جیسی نادرہ روزگار شخصیتیں اسی عہد روشن میں آسمان علم و فن پر مہر و ماہ بن کر چمکیں، ان میں بوعلی سینا خاص طور پر اپنی غیر معمولی قوت حافظہ، گوناگوں علمی فضائل و کمالات، اور کثرت تصانیف میں عدیم النظیر تھا، گو اس کا آفتاب عظمت مطلع مشرق پر طلوع ہوا لیکن آج تمام یورپ ابوعلی سینا (Avecinna) کے نام اور اس کی شہرت و عبقریت کے غلغلہ سے گونج رہا ہے، اس کی گراں قدر تصنیف القانون فی الطب مدتوں طبی بائبل سمجھی جاتی رہی اور دنیا کی بکثرت زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے، بلاشبہ ابن سینا بڑی جامع اور ہمہ جہت شخصیت کا حامل تھا، وہ بیک وقت فلسفی، طبیب، ادیب، شاعر اور ایک معاملہ فہم مدبر و مفکر سب ہی کچھ تھا، خصوصاً اس نے طب عربی کو معراج کمال پر پہونچادیا ہے ان ہی تمام کمالات و امتیازات کے باعث زبان خلق نے اس کو شیخ الرئیس اور معلم ثانی (بعد از ارسطو) کا لقب عطا کیا۔

بوعلی سینا کے بارے میں تفصیلات کا سب سے مستند ماخذ وہ مختصر رسالہ ہے، جس کا ابتدائی نصف حصہ خود شیخ نے مرتب کیا اور آخری نصف ابوعبید جوزجانی نے سپرد قلم کیا ہے



ابوعبید جوزجانی جو یورپ میں جورروس کے نام سے مشہور و متعارف ہے، شیخ کے ارشد تلامذہ میں سے تھا، وہ کامل پچیس برس تک شب و روز ابن سینا کی خدمت میں رہا ہے، اس کی درخواست پر ابن سینا نے اپنے جو حالات بیان کئے ہیں[1]، وہ اس نے خود نوشت سوانحعمری کے طور پر رسالہ مذکور کے آغاز میں دیدیئے ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ شیخ کے حالات میں اس رسالہ کو ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں بتمام و کمال اور قفطی نے اخبار الحکماء میں ملخص کر کے نقل کردیا ہے، اس رسالہ کا اصل نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے، بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے تمام تر اسی رسالہ کی بنیاد پر شیخ کے سوانح و کمالات اور تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے، اس کے علاوہ جن مآخذ میں تلاش و تفحص کے بعد شیخ کا تذکرہ مل سکا، ان کے نام یہ ہیں، ابن خلکان (ج ا ص ۱۹۰) تاج التراجم قطلوبغا (ص ۱۹) ابوالفداء (ج ۲ ص ۱۶۱) روضات الجنات (ص ۲۴۲) خزانۃ الادب (ج ۳ ص ۴۶۶) تاریخ مختصر الدول (ص ۳۲۵) اور تاریخ فلاسفۃ الاسلام لطفی جمعہ، ابھی تک اردو میں شیخ بوعلی سینا کے ساتھ باوجود ہمہ جلالت مرتبت و علوے شان خاطر خواہ اعتنا نہیں کیا گیا ہے، ذیل کی سطور اسی نقص اور خلا کو پر کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے،

ولادت اور تعلیم و تربیت شیخ ابوعلی حسین بن عبداللہ ابن سینا ۳۷۰ھ میں نواح بخارا کے ایک بڑے گاؤں خرمیثن میں پیدا ہوا، تعلیم و تربیت کی ابتدا قرآن مجید اور علم ادب سے ہوئی، دس سال کی عمر میں اس نے ان دونوں علوم میں پختگی حاصل کرلی، اس کے بعد حساب اور جبر و مقابلہ کا بڑا حصہ حفظ کرلیا، ریاضی کے ساتھ فقہ کی تحصیل شیخ اسماعیل زاہد سے کی، اسی اثناء

[1] اخبار الحکماء قفطی ص ۲۶۸،

میں حسن اتفاق سے مشہور حکیم اور فلسفی ابو عبداللہ الناتلی کا بخارا میں ورود ہوا، شیخ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے، پہلے منطق اور پھر اقلیدس و مجسطی میں دسترس حاصل کی اور بقول ابن خلکان اپنی وہبی ذہانت سے ان علوم میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ خود اپنے استاذ پر بھی گوے سبقت لے گیا، ناتلی کے خوارزم چلے جانے کے بعد شیخ نے طبعیات اور الٰہیات کی کتابیں خود پڑھنی شروع کیں، اور ان کے پیچیدہ مسائل کو اپنے غیر معمولی شغف اور انہماک سے حل کیا۔

اس کے بعد شیخ کو علم طب کا شوق پیدا ہوا اور اس کی تحصیل اس نے ایک مسیحی استاذ عیسٰی بن یحیٰی اور مشہور طبیب الحسن بن نوح القمری سے کی[۲]، اور پھر تھوڑی مدت میں جبکہ اس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی، طب میں اس قدر کمال پیدا کر لیا کہ

اصبح فیہ عدیم القرین فقید المثیل — وہ اس فن میں فقید المثال اور عدیم النظیر
واختلف الیہ فضلاء ھذا الفن — ہو گیا، اور اس کے پاس بڑے بڑے اطباء
وکبراء لا یعرفون علیہ القراءۃ[۳] — اور فضلاء آکر طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے،

علم طب میں اس غیر معمولی مہارت کا سبب یہ تھا کہ جب اس نے اپنی عنان توجہ اس فن کی طرف منعطف کی تو بقول خود کبھی پوری رات نہیں سویا، اور دن کو بھی اس کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہ تھا،[۴] شیخ کے انہماک علمی اور شبانہ روز مصروفیت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ رات میں چراغ سامنے رکھ کر مطالعہ شروع کر دیتا اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو نبیذ کا ایک پیالہ پی لیتا، اس حد سے بڑھے ہوئے شوق مطالعہ کا نتیجہ یہ تھا کہ رات کو جب کسی

---

[۱] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۰ [۲] طبقات الاطباء ج ۱ ص ۲۸ [۳] خود شیخ کے بیان میں فن طب میں کسی استاد سے فیضیاب ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔ [۴] روضات الجنات ص ۲۴۲ [۵] عیون الانباء ج ۲ ص ۴،



علمی مسئلہ پر غور کرتے کرتے سو جاتا تو اکثر پیچیدہ سوالات خواب ہی میں حل ہو جاتے،[۱] اس طرح اس کو صرف اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون میں اس قدر کمال حاصل ہو گیا کہ پھر بقیہ عمر میں اس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

بلاشبہہ تاریخ انسانی کا یہ ایک نادر واقعہ ہے، کہ اتنی کم عمری میں شیخ بوعلی سینا کی طبی قابلیت کی شہرت مغرب و مشرق میں پھیل گئی، چنانچہ بخارا کا فرماں روا نوح ابن منصور سامانی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے معالجہ میں تمام اطبا ناکام ہو گئے، بالآخر اس نے شیخ کو طلب کیا، اس کے علاج سے امیر موصوف کو کامل شفا حاصل ہو گئی، اور اظہار تشکر کے طور پر اس نے شیخ کو اپنے ظل عاطفت میں لے لیا، اور اپنے مقربین خاص میں شامل کیا، مزید برآں اس نے شیخ کو کتب خانہ شاہی سے استفادہ کی اجازت دیدی، اس کتب خانے کے بارے میں ابن خلکان رقمطراز ہیں:

کانت عدیمۃ المثل فیھا — وہ کتب خانہ عدیم المثال تھا اس
من کل فن من الکتب المشہورۃ — میں ہر فن کی مشہور کتابیں موجود تھیں
بایدی الناس وغیرھا مما — جن میں بہت سی تو ایسی تھیں جو
لا یوجد فی سواھا ولا سمع — اس کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی
باسمہ فضلاً عن معرفتہ[۲] — تھیں، اور کسی نے ان کا نام بھی نہیں

شیخ نے اس کتب خانہ سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا، اور اس کی نادر الوجود کتابوں کے بیش قیمت فوائد ذہن نشین کر لئے، سوئے اتفاق سے اس گراں قدر کتب خانہ میں آگ لگ گئی، اور تمام ذخیرۂ نوادر خاکستر ہو گیا، بعض لوگ اس آتش زدگی کا ذمہ دار شیخ کو

---

[۱] اخبار الحکماء قفطی ص ۲۷۰ [۲] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۱،

خیال کرتے ہیں، تاکہ وہ ان علوم کو اپنی طرف منسوب کرلے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ ان علوم
کا سب سے بڑا عالم ہے،[1] لیکن یہ معاصرانہ منافست کی باتیں ہیں، شیخ جیسے قدردانِ علم کے
بارہ میں یہ سوءِ ظن نہیں کیا جاسکتا ہے، الغرض بیس سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے وہ تمام
علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہوگیا،

**سیاسی مصروفیات** | شیخ ۲۱ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوگیا، وہ اپنے والد کے ساتھ
نوح بن منصور سامانی کی ملازمت میں تھا، لیکن ۳۹۲ھ میں جب سامانیوں کا نظام سلطنت
درہم برہم ہوگیا تو حالات نے شیخ کو بخارا چھوڑنے پر مجبور کیا، خود کہتا ہے،

ثم دعتنی الضرورة الی الاخلال — پھر حالات نے بخارا چھوڑنے اور
ببخارا والانتقال الی کرکانج — کرکانج منتقل ہونے پر مجبور کیا،

اس کے بعد پھر شیخ نے کہیں بھی مستقل قیام نہیں کیا، اور مسلسل سفر کرتا رہا، چنانچہ
نسا، ابیورد، طوس، دہستان، شقان، سمیقان وغیرہ ہوتا ہوا امیر شمس المعالی قابوس
ابن وشمگیر کے دربار میں حاضر ہونے کی غرض سے جرجان پہونچا، لیکن اس کے دربار تک رسائی
ہونے سے قبل ہی فوج نے بغاوت کرکے امیر مذکور کو قلعہ میں مقید کردیا جہاں ۴۰۳ھ میں
اسکا انتقال ہوگیا، شیخ نے جرجان میں متعدد کتابیں مثلاً قانون کا ابتدائی حصہ، مختصر المجسطی اور
بہت سے رسائل تصنیف کئے، اس کے بعد وہ جرجان سے نکل کر رے گیا، اور کچھ دن
بعد قزوین ہوتا ہوا ہمدان آیا،
اسی زمانہ میں امیر شمس الدولہ سخت دردِ قولنج میں مبتلا ہوا، اور شیخ کے علاج سے
خدا نے اس کو شفا دی، امیر مذکور نے نہ صرف اس کو خلعت فاخرہ سے مفتخر کیا، بلکہ اپنا

[1] ابوالفداء ج ۲ ص ۱۴۲، [2] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۴،



وزیر بھی بنایا، لیکن فوجیوں میں اس کی وزارت کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی اور
اور انھوں نے شیخ کے خلاف بغاوت کردی، اس کے مکان پر حملہ کرکے لوٹ لیا اور شیخ
کو گرفتار کرکے امیر شمس الدولہ سے اس کو قتل کرنے کا مطالبہ کیا، جس کو اس نے منظور نہیں
کیا، اور بلطائف الحیل ملک بدر کردیا، اتفاق سے شمس الدولہ دوبارہ اس عارضہ میں علیل
ہوگیا، اور پھر شیخ کو علاج کے لئے بلایا، اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ اس کو دوبارہ
منصبِ وزارت تفویض کیا جس پر وہ شمس الدولہ کے انتقال تک فائز رہا،

**فضائل وکمالات** | جیسا ذکر ہوچکا ہے، شیخ بوعلی سینا کی تعلیم کی ابتدا عربی ادب سے ہوئی
تھی، ۶ سال کی عمر میں اس نے اس کی تحصیل شروع کی تھی، اور صرف چار سال کی قلیل
مدت میں علوم ادبیہ میں اس کی مہارت کا یہ عالم ہوگیا کہ بقول ابن ابی اصیبعہ اس نے
اس کے بعد زندگی میں عربی ادب کا دوبارہ عربی ادب کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا، اس
قلیل ترین مدت ہی میں اس نے اس پر اس قدر عبور اور ملکہ راسخہ حاصل کرلیا کہ
عربی کے اساطین ادبا کے اسلوبِ نگارش اپنا سکتا تھا،[1] اس سلسلہ میں اس نے
خود اپنے حالات میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، کہ ایک بار امیر علاء الدولہ کے دربار میں
لغت کے کسی مسئلہ پر بحث چھڑ گئی، شیخ نے بھی اس مباحثہ میں حصہ لینا چاہا، لیکن وہاں
موجود مشہور ادیب ابومنصور الجبائی نے اس پر لغت سے ناواقفیت کا طعن کرتے
ہوئے کہا کہ آپ صرف حکیم وفلسفی ہیں۔
تاریخ الحکما، اور طبقات الاطباء دونوں میں مذکور ہے، کہ اس کے بعد شیخ نے
خود کو دو تین سال تک مسلسل لغت کی کتابوں کے مطالعہ میں منہمک کردیا، اور اس

[1] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۷،

مدت میں لغت پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ اس کے بعد اس نے تین قصیدے لکھے، جن میں نوادر لغت کا استعمال کیا، اور تین رسائل مرتب کئے، ایک ابن العمید کے طرز میں، دوسرا صابئی کے اسلوب میں اور تیسرا صاحب بن عباد کے طرز نگارش میں[1]۔

شیخ کی پوری زندگی "تگاپوئے دمادم" میں گذری، وہ ہم کو ہر دم رواں، پیہم دواں نظر آتا ہے، علمی انہماک، سیاسی سرگرمیاں، درس و تدریس اور پھر تصنیف و تالیف یہ سب مصروفیتیں ایک ساتھ ہی جاری رہتی تھیں، اور ہر چیز پوری یکسوئی اور جمع خاطر کے ساتھ، جس زمانے میں وہ امیر تاج الدولہ کے خوف سے شیخ ابو غالب عطا کے گھر میں روپوش تھا، اس نے بغیر کسی کتاب کے مطالعہ کے محض زبانی یادداشت سے شفاء کے تقریباً "بیس" اجزا لکھے، اس زمانے میں تصنیف کی روزانہ مقدار "پچاس" ورق تھی، اس طرح طبیعیات اور الٰہیات کا پورا حصہ، کتاب الحیوان اور کتاب النباتات کے سوا لکھ لیا، اس کے بعد منطق کا ایک حصہ لکھا[2]، اسی دوران تاج الملک نے علاء الدولہ سے خفیہ خط و کتابت کے الزام میں شیخ کو گرفتار کر کے فردجان کے قلعہ میں نظربند کر دیا، جہاں وہ چار مہینے تک رہا، اسی زمانے میں اس نے کتاب الہدایہ، رسالہ حی بن یقظان، رسالۃ الطیر اور کتاب القولنج لکھی۔

شیخ بو علی سینا، آخر عمر تک ایک نہایت راسخ العقیدہ مسلمان رہا، اگرچہ اس کے باپ اور بھائی دونوں اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ شیخ کو اس مذہب کی دعوت دیتے تھے، لیکن وہ اس سے قطعی متاثر نہ ہوا، جس سے اس کے استقلال رائے، استقلال فکر اور استقلال ارادہ کا اندازہ ہوتا ہے، اعتقاد کے ساتھ اس کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ اور اچھی تھی، تعلیم کے ابتدائی زمانے میں جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ اس کے سامنے آتا تو وہ سیدھا

---

[1] اخبار الحکما ص ۲۷۰، [2] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۔۱، [3] حکمائے اسلام اوّل ص ۲۰۹،



جامع مسجد کا رخ کرتا، وضو کر کے صلوٰۃ حاجت پڑھتا، اور درگاہ خداوندی میں تضرع و زاری کرتا تھا جس کے نتیجہ میں بقول خود وہ پیش مسئلہ پانی ہو جاتا[1]۔

شیخ ذوق شعر و سخن سے بھی بہرہ وافر رکھتا تھا، اس کے عربی قصائد صاحب طبقات الاطباء نے پورے نقل کر دیئے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے متفرق اشعار بھی ملتے ہیں، اس کے قصیدے بالکل جاہلی شعرا کے انداز پر ہیں، یعنی معشوق کے کھنڈرات پر آہ و زاری وغیرہ سے تشبیب کی ابتدا کرتا ہے، علاوہ ازیں نادر تشبیہات و استعارات سے بھی اس کا کلام مزین ہے[2]۔

وفات | اگرچہ شیخ بو علی سینا کے جسمانی قویٰ نہایت اچھے تھے، لیکن مسلسل غیر محتاط زندگی گذارنے کے باعث اس کی صحت کافی خراب رہنے لگی تھی، اور مختلف عوارض اس کی جان کے ساتھ لگ گئے، اسی زمانہ میں امیر علاء الدولہ کے ساتھ بیماری کی حالت میں ہمدان کی طرف گیا، راستہ میں بیماری نے نہایت شدت اختیار کر لی، ہمدان پہونچ کر اس کو اپنی شفا سے بالکل مایوسی ہو گئی اور پھر اس نے علاج چھوڑ کر خود کو خدا کے حوالے کر دیا، غسل طہارت کر کے توبۃ النصوح کی اور اپنا تمام مال و متاع فقرا کو خیرات کر دیا، تمام غلام آزاد کر دیئے، اور ہر تیسرے دن ایک قرآن ختم کرتا رہا، بالآخر اس کا جام حیات لبریز ہو گیا، اور رمضان ۴۲۸ھ میں جمعہ کے دن ہمدان ہی میں وفات پائی[1]، ابن خلکان نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ شیخ کا انتقال اصفہان میں ہوا، لیکن پہلی روایت کو اصح قرار دیا ہے[3]۔

تصنیف و تالیف | شیخ بو علی سینا بہت زود نویس مصنف تھا، اس نے اکیس سال کی عمر سے یہ مشغلہ اختیار کیا اور عمر بھر اس کا قلم مختلف موضوعات پر گوہر افشانی کرتا رہا، اس لئے

---

[1] تاریخ مختصر الدول ص ۳۲۵ [2] خزانۃ الادب ج ۴ ص ۴۶۶

[3] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۲،

اس نے اپنی تصنیفات کا ایک عظیم ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اس کی مطول و مختصر کتابوں کی مجموعی تعداد سو کے قریب ہے[1] قفطی نے شیخ کی تالیفات کی جو فہرست دی ہے، اس میں اکیس (۲۱) بڑی اور چوبیس (۲۴) چھوٹی کتابوں کے نام درج ہیں[2]، خود شیخ کے شاگرد ابوعبید جوزجانی نے بائیس (۲۲) بڑی کتابوں اور اکیس (۲۱) رسائل کے نام شمار کرائے ہیں، لیکن ابن ابی اصیبعہ نے اس فہرست پر اضافہ کرتے ہوئے، شیخ کی ۱۰۵ مزید چھوٹی بڑی کتابوں کا ذکر کیا ہے[3] بروکلمن نے اپنی مشہور کتاب میں ابن ابی سینا کی تصنیفات کی جو فہرست دی ہے وہ قفطی سے بھی زیادہ طویل ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے دینیات اور علم مابعد الطبیعیات پر اڑسٹھ (۶۸) کتابیں لکھی ہیں، اور گیارہ (۱۱) کتابیں فلکیات اور فلسفہ طبیعیات پر اور سولہ (۱۶) طب پر تالیف کی ہیں، اور چار اس کے کلام کے مجموعے ہیں، اس طرح کل ننانوے (۹۹) کتابیں ہوئیں۔

اس کثرت تصانیف پر اس وقت اور بھی تعجب و حیرت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بوعلی سینا کی پوری زندگی مختلف النوع مشاغل اور سرگرمیوں سے معمور رہی ہے، اور اس کو کبھی جمع خاطر کے ساتھ کہیں بھی قیام کرنے کا موقع نہیں مل سکا، لیکن باایں ہمہ اس کی کسی بھی تصنیف پر اس کے انتشار فکر و ذہن کا سایہ بھی نہیں پڑ سکا ہے، خواہ وہ قید و بند میں رہا ہو یا منصب وزارت پر فائز۔ ہر حال میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا، اور یہ مذکور ہوا کہ اس نے روپوشی کی حالت میں بغیر کسی کتاب کی مدد کے شفا کے ۲۰ جزو لکھے، زود نویسی کے ساتھ وہ تصنیف میں محنت و جانکاہی بھی بہت کرتا تھا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ منطق میں شیخ کی ایک کتاب مختصر الاصغر پر کسی اہل علم کو کچھ شکوک پیدا ہوئے، اور اس نے اپنے اشکال مرتب کرکے شیخ کو ارسال کیے، قاصد ان کو لے کر شام کے وقت

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۹۳، [2] تاریخ الحکماء ص ۴۱۸، [3] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۱۰،



شیخ کے پاس پہونچا، ابن سینا نے نماز عشاء سے فارغ ہو کر ان مسائل کا جواب لکھنا شروع کیا اور نصف شب تک متواتر اس کا اشہب قلم رواں رہا،

ابن سینا کی بعض کتابیں متعدد ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں، مثلاً کتاب الحاصل و المحصول جو اس نے اپنے ایک ہمسایہ عالم ابوبکر البرقی کی فرمائش پر لکھی تھی بیس (۲۰) جلدوں میں ہے، اسی طرح کتاب الشفاء ۱۸ جلدوں کتاب القانون ۱۴ جلدوں اور کتاب الانصاف ۲۰ جلدوں اور کتاب لسان العرب دس جلدوں پر مشتمل ہیں، شیخ کی مشہور ترین کتابوں میں شفا، القانون اور الاشارات والتنبیہات سب سے زیادہ ممتاز اور لائق ذکر ہیں، بقول براؤن یہ تینوں کتابیں دنیا کی علمی امہات کتب شمار کی جاتی ہیں[1]، کتاب الشفا کو حکمت کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے، انوری اپنے ایک مشہور قصیدہ میں اس کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے،

مرد را باید کہ حکمت نیز در تن گیرد ش     تا شفائے بوعلی خوانند شاہ بحتری

شفا کے شارحین میں ابوعبداللہ محمد بن احمد البیجانی[2]، محمد البحارثی سرخسی اور محمد بن علی بن ابی نصر الاسفرائنی[3] کے نام خصوصیت سے نمایاں ہیں، متاخرین میں شمس الدین منصور[4]، صدر شیرازی[5] اور آقا حسین خوانساری[6] نے اپنے قیمتی حواشی سے اس کو مزین کیا، علاوہ ازیں شمس الدین خسرو شاہی اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے بھی اس کی تلخیص کی ہے[7]،

اسی طرح منطق و حکمت میں شیخ کی تصنیف الاشارات والتنبیہات کے ساتھ بھی

[1] تاریخ ادبیات ایران ص ۱۳۰ ج ۲، [2] کشف الظنون ج ا بیان شفا، [3] جشن نامہ ابن سینا، ذبیح اللہ صفا ج ا ص ۱، [4] ایضاً [5] فہرست کتب خانہ رامپور حکمت ۴۰ [6] ایضاً ۷۱-۷۲ [7] جشن نامہ ابن سینا ج ا ص ۱،

خصوصی اعتنا کیا گیا ہے، یہ کتاب مشرقی ملکوں خصوصاً ہندو ایران کے اعلیٰ نصاب میں آج بھی داخل ہے، اس کے شروح و حواشی لکھنے والوں میں امام رازی، محقق طوسی، سراج الدین ارموی، رفیع الدین جیلی[۱] اور عز الدین بن منصور[۲] وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، نجم الدین اللبودی نے "مختصر الاشارات والتنبیہات" کے نام سے اس کی ایک تلخیص بھی لکھی ہے[۳]،

**القانون فی الطب** | شیخ کی سب سے اہم تصنیف جس نے ...... علم و فن کی تاریخ میں اس کو حیات جاوداں عطا کی ہے، القانون فی الطب ہے، آج تک اس کتاب کو علم طب کا ایک عظیم الشان اور گراں قدر خزانہ سمجھا جاتا ہے، بقول ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل "اس میں بوعلی سینا اپنی لطافت بیان میں ارسطو اور جالینوس پر بھی گوئے سبقت لے گیا ہے[۴]"، یورپ میں بھی یہ کتاب صدیوں طبی درس گاہوں کے نصاب کا ایک اہم حصہ بنی رہی اور وہاں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لاطینی زبان میں اس کے تقریباً بیس[۵] اڈیشن شائع ہوئے، قفطی اس کی اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہے،

هو کتاب جلیل و کناش نبیل
اشتمل علی علم الطب و عملہ
حسن الترتیب[۶]،

(ترجمہ) یہ ایک شاندار کتاب اور قابل قدر بیاض ہے، جو علم طب کے علمی و عملی حصوں پر مشتمل ہے اس کے مضامین میں حسن

نظامی عروضی لکھتا ہے کہ اگر بقراط و جالینوس کو حیات نو مل جائے تو بھی وہ ابن سینا کے قانون کے سامنے سر عقیدت خم کر دیں[۷]، سر ولیم آسلر نے قانون کو طبی بائبل سے موسوم کیا ہے[۸]،

---

۱ طبقات الاطباء ج ۲ ص ۱۶، ۲ فہرست قدیم کتب خانہ رام پور حکمت ۱/۹۳ ۳ طبقات الاطباء ج ۲ ص ۱۸۱،
۴ عربین میڈیسن ص ۸۰، ۶ تاریخ الحکماء ص ۲۲۲ ۷ چہار مقالہ گب اڈیشن،
۸ ایولیوشن آف ماڈرن میڈیسن مطبوعہ ۱۹۲۳ء آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن ص ۹۰



قانون پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد امور کلیہ، دوسری ادویہ مفردہ تیسری معالجات، چوتھی امراض عامہ اور پانچویں مرکبات کے بیان میں ہے، قانون کی تلخیصیں اور شروح بے شمار لکھی گئی ہیں، سب سے زیادہ مشہور و مقبول تلخیص محمود بن عمر الجغمینی کی قانونچہ اور ابوالحسن علاء الدین قرشی کی موجز ہیں، پھر قانونچہ کی شرح فارسی زبان میں حکیم محمد اکبر ارزانی نے لکھی ہے، اور موجز القانون کی شروح اقسرائی، کرمانی تبریزی، سدیدی اور نفیسی کے ناموں سے لکھی گئیں[۱]، اور ان میں سے بعض اس قدر مقبول ہوئیں کہ آج تک داخل نصاب ہیں، علاوہ ازیں قانون کی ایک تلخیص خود شیخ کے ممتاز شاگرد شرف الزماں الایلاقی (م ۴۶۰ھ) نے مختصر کے نام سے لکھی[۲]، جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں محفوظ ہے،

تلخیصات قانون کی شرح کے علاوہ خود اصل کتاب کی بہت سی ضخیم شروح لکھی گئی ہیں، جن میں شرح خجندی، شرح سمرقندی، شرح آملی، شرح قرشی اور شرح گیلانی کے نام خاص طور پر نمایاں اور قابل ذکر ہیں، اسی طرح ہندوستان میں بھی قانون کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا گیا ہے، اس کے ہندی شارحین اور حاشیہ نویسوں میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں، شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (اس شرح کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے[۳])، حکیم محمد شریف خاں[۴]، حکیم اسحٰق بن اسماعیل دہلوی[۵]، حکیم معز الدین خالص پوری[۶]، حکیم علوی خاں[۷]، حکیم شفائی خاں[۸]، شیخ محمد مومن جزائری[۹]، حکیم محمد اکبر ارزانی[۱۰]، سید عبد الفتاح بن عبد اللہ الملاہوری[۱۱] وغیرہ،

---

۱ کشف الظنون جلد ۲ ۲ تذکرہ قانون ۳ ایضاً ۴ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۴۲ ۵ ایضاً ۶ ایضاً ص ۳۰،
۷ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ۸ ایضاً ص ۲۱۳-۲۲۲ ۹ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۳۲۷ ۱۰ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۳۲۴، ۱۱ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۰۷ ۱۲ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۳۲،

الغرض شیخ کی اس مایہ ناز تصنیف کی گونج صدیوں گذر جانے کے باوجود آج بھی دنیائے
علم و فن میں اسی طرح قائم ہے، جیسی عہد تصنیف میں تھی بلکہ مرور وقت کے ساتھ اس کی
عظمت، اہمیت اور مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے،

تدارک الخطاء — ان تالیفات کے علاوہ شیخ کی ایک اور بے نظیر طبی تالیف بھی ہے، جس کا
نام چہار مقالہ میں نظامی سمرقندی نے "تدارک انواع الخطاء فی التدبیر الطبی"
بیان کیا ہے[1] اور حاشیہ نگار چہار مقالہ علامہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے اس کا پورا نام
"دفع المضار الکلیۃ عن الابدان الانسانیۃ بتدارک انواع خطاء
التدبیر" ذکر کیا ہے[2]، یہ کتاب ۱۳۰۵ھ میں مطبع خیریہ مصر سے ابوبکر رازی کی کتاب
منافع الاغذیہ و دفع مضارہا کے حاشیہ پر شائع ہوئی ہے[3]، قزوینی نے تصریح کی ہے
کہ شیخ نے یہ کتاب خوارزم شاہ کے علم دوست وزیر ابو الحسین احمد بن محمد السہلی کے
لئے تالیف کی تھی، شیخ نے وزیر موصوف کے حکم کی تعمیل میں اسکے علاوہ ایک اور کتاب "قیام
الارض فی وسط السماء" کے نام سے بھی لکھی تھی، چنانچہ ثعالبی نے یتیمۃ الدہر[4]، قفطی نے
تاریخ الحکماء[5] ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء[6] اور یاقوت رومی نے معجم الادباء[7] میں بیان کیا
ہے کہ شیخ نے ابو الحسین احمد السہلی کے لئے دو کتابیں لکھیں، ایک قیام الارض فی وسط السماء
اور دوسری التدارک لانواع خطاء التدبیر،

اس کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں خود شیخ ابن سینا کا بیان ہے کہ "میں نے
اس وزیر کے تعمیل ارشاد میں مختلف معلومات حاصل کر کے ایک لڑی میں پرونے کا قصد

---

۱ چہار مقالہ گب اڈیشن مطبوعہ لیدن ص ۱۱، ۲ حواشی چہار مقالہ ص ۲۳۷، ۳ معارف: اس کا
ایک نسخہ کتب خانہ دار المصنفین میں بھی موجود ہے، ۴ یتیمۃ الدہر ج ۴، ص ۱۶۷، ۵ تاریخ الحکماء ص ۴۱۴، ۶ طبقات الاطباء
ج ۲ ص ۱۹-۲۰، ۷ معجم الادباء ج ۲ ص ۱۰۳،



کیا، جس میں حکمت کے متعلق معلومات کا خزانہ ہو، لہذا ایک کتاب دفع المضار الکلیۃ
للابدان الانسانیۃ کے نام سے مرتب کی،

تدارک الخطاء کے مخطوطات رضا لائبریری رام پور، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد اور
مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ میں محفوظ ہیں، یہ لالہ جنگلی مل دہلوی کی فرمائش پر سید
فخر الدین احمد کے زیر اہتمام اعلاء المطابع دہلی سے بھی طبع ہو چکی ہے، اس کا ایک نسخہ
ہمارے یہاں لٹریری ریسرچ یونٹ کی زینت ہے، علاوہ ازیں اس کے ایک فارسی
ترجمے کا مخطوطہ (جس پر مترجم کا نام درج نہیں) برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے اس کی
تاریخ کتابت ۱۰۸۸ھ ہے، مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ جمال الدولہ والدین حسین ترخاں کے لئے
لکھا گیا تھا[1]،

فارسی زبان میں اس کا ایک اور ترجمہ "موجز عظیم النفع" کے نام سے شیخ حسین انصاری
المخاطب بہ حاذق خاں نے کیا ہے، جو مطبع مجتبائی دہلی میں ۱۸۹۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ
ہوا، علمی و فنی نقطۂ نظر سے بلاشبہ یہ کتاب اس لائق ہے، کہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا جائے
اور اگر ساتھ ہی اس موضوع پر دوسری معیاری کتابوں کا مطالعہ کر کے مزید مواد پیش
کیا جائے تو اس کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے،

یہ کتاب سات مقالات پر مشتمل ہے، پہلے مقالہ میں اعتدال مزاج کی توضیح، اجتناب
امور اور مختلف النوع امور میں تعدیل کا بیان ہے، اس مقالہ میں پوری کتاب کا لب لباب آگیا
ہے، اسی لئے یہ نسبتہً طویل بھی ہے، دوسرے مقالہ میں مختلف ہواؤں اور خصوصاً گرم اور متعفن
ہواؤں سے بحث کی گئی ہے، تیسرا مقالہ حمام سے متعلق ہے، اس میں حمام کی ضرورت و

---

۱ کتاب التدارک ص ۲۳۲، ۲ رسالہ جدیدہ با مقدمہ و حواشی از حکیم سید ظل الرحمن ص ۱۴۲،

اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی مضرت بھی واضح کی گئی ہے، چوتھے مقالہ میں غذاؤں کا بیان ہے، پانچویں میں پانی کے اقسام بیان کئے گئے، اور مشروبات کا ذکر ہے، چھٹے مقالہ میں مختلف حرکتوں سے عارض ہونے والی مضرتوں اور مختلف حالات میں مختلف حرکات و سکنات سے پیدا ہونے والے نقصانات اور اس کے دفعیہ کے اصول درج ہیں، کتاب کا آخری مقالہ استفراغ کی مختلف صورتوں اور ان میں عدم اعتدال و توازن کے نقصانات و تدارک سے متعلق ہے۔

شیخ نے تدارک الخطا میں انتہائی سلیس اور عام فہم انداز نگارش اختیار کیا ہے، اور غیر ضروری تفصیلات اور حشو و زوائد سے حتی الامکان اجتناب کیا، اس کتاب میں حفظانِ صحت کے بہت سے ایسے مسائل آگئے ہیں، جن کی طرف اطباء قدیم نے بالعموم اعتنا نہیں کیا تھا، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام و خواص سب کیلئے اس مفید اور کارآمد خزانے کو اردو میں منتقل کرکے وقف عام کیا جائے، یہ نہ صرف ایک اہم علمی خدمت ہوگی، بلکہ خالص فنی حیثیت سے بھی یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہوگا، اور عربی و فارسی زبانوں سے ناواقف لوگ بھی اس سربند خزانۂ طب سے فائدہ اٹھا سکیں گے،

## حکمائے اسلام

اس میں دوسری صدی ہجری سے لیکر ہندوستان کے خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام حکمائے اسلام کے مستند حالات ان کی علمی خدمات اور ان کے فلسفیانہ نظریات و افکار کی تفصیل بیان کی گئی ہے، پہلی جلد میں پانچویں صدی ہجری تک کے حکماء کے حالات ہیں، جن میں حکیم بو علی سینا بھی داخل ہیں، اور دوسری جلد میں متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات ہیں، ان ہی میں حکمائے خیرآباد و فرنگی محل داخل ہیں، مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی جلد اول ۷۵-۵ جلد دوم ۹۵-۱۰



# غزالی مشہدی

از ڈاکٹر محمد سلمان عباسی صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی۔

سولھویں صدی کی ابتدا میں شاہ اسمٰعیل اول (۱۵۰۰-۱۵۲۴ء) نے ایران میں صفوی حکومت کی بنیاد رکھی، یہ ایران کی تاریخ کا بڑا ہنگامہ خیز دور تھا، اس کے حکمراں سرحدی اور اندرونی خطروں کے تدارک میں اس قدر مصروف تھے کہ شعراء اور ادبا کی سرپرستی تو درکنار انھوں نے ان کی باقاعدہ حوصلہ شکنی شروع کردی تھی اور ان پر بہت سی پابندیاں عائد کردی تھیں، شاہ اسمٰعیل کا بیٹا شاہ طہماسپ (۱۵۲۴ء-۱۵۷۶ء) بھی اپنے پیش رو کی طرح غیر ملکی حملوں اور اندرونی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی قوت بڑھاتا رہا، اس نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں شعراء و ادبا کی قدردانی کی، لیکن جلد ہی مذہب اور علمائے مذہب سے اس قدر متاثر ہوگیا کہ اس نے یہ حکم دیدیا کہ بادشاہوں اور امیروں کی مدح کے بجائے شعراء صرف ائمہ کرام کی شان میں قصائد کہا کریں، مذہبی شاعری کے علاوہ ہر قسم کی شاعری پر مکمل پابندی عائد ہوگئی، ان حالات میں ایرانی شعراء اور ادبا، اپنے وطن میں گھٹن محسوس کرنے لگے، اور بقول بدایونی کے شاید یہی سب سے بڑا سبب تھا کہ ایک سو ستر نامور ایرانی شاعر اسی دور میں ترکِ وطن کرکے ہندوستان آگئے[1]،

ہندوستان کی ادب نوازی، علم دوستی اور قدر افزائی کا سلسلہ صرف مغل حکومت تک ہی

[1] منتخب التواریخ ص ۲۴۳،

محدود نہ تھا، بلکہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ امراء اور دکن کی خود مختار ریاستوں میں بھی ادب پروری اور شاعر نوازی کا دور دورہ تھا،

علی عادل شاہ کی ادبی سرپرستیاں دکن کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہیں، مرزا محمد قاسم تاریخ فرشتہ میں رقمطراز ہیں،[1]

| | |
|---|---|
| سادات و علماء و فضلاء را گرامی | (علی عادل شاہ) علماء اور فضلاء کا احترام |
| داشتہ ادرارات معین کردہ گی | کرتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے ان کے |
| ہمت آں گزرانید کہ مردم خوب در | روزینے مقرر کئے، اور کوشش کی کہ عمدہ |
| درگاہش جمع شوند، لہٰذا در اندک | اور تجربہ کار لوگوں کو اپنی بارگاہ میں |
| فرصتی از ایران و توران و سائر اقالیم | جمع کرلے، تھوڑے ہی عرصہ میں ایران |
| بسی مردم خوب تشریف آوردہ | توران اور دوسرے ممالک سے بہترین |
| بیجاپور رشک ربع مسکون گردید | لوگ آکر بیجاپور میں جمع ہوئے اور بیجاپور |
| و علی عادل شاہ کہ بہ ارث ادسیدہ | رشک ارم بن گیا، علی عادل کو جو خزانہ |
| بود و یک و نیم کرور ہن می شد در | میراث میں ملا تھا اور جو ڈیڑھ کروڑ ہن تھا |
| اندک مدت بر خلق باشید | سے تھوڑے ہی زمانہ میں لوگوں کو تقسیم کردیا، |

ابراہیم عادل شاہ نے بھی فیاضی اور سرپرستی کی یہ عادت اپنے چچا اور پیش رو علی عادل شاہ سے ورثہ میں پائی تھی،

ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنی قدر افزائیوں کی وجہ سے ایران تک میں مشہور تھا، اس نے ادب اور ارباب ادب کی اعلیٰ پیمانہ پر سرپرستی کی اور انھیں ہر طرح سے نوازا وہ

[1] تاریخ فرشتہ (مرزا محمد قاسم) ص ۲۵، روضہ ۲، مقالہ ۳،



بڑا ہی عادل، نیک طینت اور خوش مزاج حکمراں گذرا ہے، اس کی انہی خوبیوں اور اوصاف سے متاثر ہوکر سنجر کاشانی نے اس کی تعریف میں کہا ہے،[1]

| | |
|---|---|
| دو شاہ شاعر پرور بلند پایہ نام شدند | نخست والی غزنیں دوم خدیو دکن |
| رسد بہ عہد تو شاعر بہ پایۂ علی | زہے نوازش شاہ و زہے ظہور سخن |

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنے دربار میں بہت سے نامور ادباء اور شعراء کو مدعو کیا، انھیں حسب مراتب انعامات و اکرامات سے نوازا اور صلہ، جاہ و مناصب کی داد و دہش میں کوئی کمی باقی نہ رکھی، اس کے دربار میں بہت سے نامور ایرانی شاعر موجود تھے، جن میں ملک قمی اور ظہوری ترشیزی صف اول میں شمار ہوتے ہیں، فیضی نے اکبر کو اسی سلسلہ میں تحریر کیا تھا،[2]

| | |
|---|---|
| در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد و | احمد نگر میں دو بلند مرتبہ شاعر ہیں جن میں |
| صافی مشرب اند و در شعر مرتبہ عالی | ایک ملک قمی ہیں جو کسی سے بہت کم |
| دارند یکی ملک قمی کہ کمیں کم اختلاف | اختلاف کرتے اور ہمیشہ ان کی آنکھیں |
| می کند و ہمیشہ مژہ تر سے دارد و | اشک آلود رہتی ہیں، دوسرے ملا ظہوری |
| دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگیں کلام است | جن کا کلام نہایت رنگین ہوتا ہے، |

ہر چند کہ یہ فیاضیاں اس پیمانہ پر نہ تھیں جیسی کہ مغل سلاطین کے درباروں میں تھیں اور جن کی توقع لے کر ان لوگوں نے سرزمین ایران کو خیرباد کہہ کے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا تھا، لیکن دکن کی تاریخ ایسے دریادل اور فیاض حکمرانوں سے بھری پڑی ہے، جنھوں نے شعرا اور ادبا کو ہر موقع پر زر و جواہر سے نوازا، ظہوری نے اپنا مشہور "ساقی نامہ" برہان نظام شاہ کی خدمت میں روانہ کیا تھا، برہان نظام شاہ کو اگرچہ شعر و ادب سے زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن

[1] سرو آزاد (غلام علی آزاد) ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۳۲

وہ ظہوری کے ساقی نامے سے اس قدر متاثر ہوا کہ خزانے سے لدے ہوئے کئی ہاتھی اسے تحفے کے طور پر دیئے، اور اس کی قدر افزائی کی ادب نوازی کا یہ جذبہ ہندوستانی امراء اور روساء کے دربار میں عام تھا، اور ہندوستانی تہذیب اور درباری روایات کا جزو بن چکا تھا، صرف دکن ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کا یہی حال تھا، البتہ دکن کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے حکمرانوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی ان باکمالوں کا استقبال کیا، سمندر کی راہ سے آنے والوں کی پہلی منزل دکن ہی کی سرزمین ہوتی تھی، اسی لئے علم و ادب کی سرپرستی کے سلسلہ میں دکن کا نام سرفہرست نظر آتا ہے، ان میں سے کچھ دکن ہی میں رچ بس گئے اور کچھ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جا کر قیام پذیر ہوئے اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کر کے قبولیت خاص و عام حاصل کی، ان میں سے کچھ شعراء نے مغل سلاطین کے دربار میں رسائی حاصل کی، اور کچھ امراء و روساء کے درباروں سے وابستہ رہے، جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور مال و جواہر سے نوازا گیا،

جب ایران میں فارسی شاعری کی ساکھ گر رہی تھی اسی دور میں ہندوستان میں وہ اوج کمال پہ پہنچ چکی تھی، گوشہ گوشہ میں اس کا بول بالا تھا، اور ہر طبقہ کی طرف سے اسے خوش آمدید کہا جا رہا تھا، تصوف جو کہ فارسی شاعری کی جان ہے اب ہندوستانی ذہنوں میں بھی سرایت کر رہا تھا، شہنشاہ اکبر جو بذات خود علم کا دلدادہ اور سرپرست تھا، تصوف کی اس لہر میں ڈوب کر سرشار ہو گیا، اسی کا اثر تھا کہ وہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری اور فتح پور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیمؒ سے والہانہ عقیدت رکھتا تھا، اس دور میں فارسی شاعری نے جو فروغ پایا، اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی، سلاطین و امراء شعراء و ادباء کی محض سرپرستی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے



اندر ایسے ذی علم اور صاحب نظر بھی تھے جو ان شاعروں اور ادیبوں کو اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے،

مغل دربار اکبر کی زیر سرپرستی منبع علم و ادب بنا ہوا تھا، حکیم ابوالفتح گیلانی، عبدالرحیم خان خاناں اور ملک الشعراء فیضی جیسی اعلیٰ مرتبہ اور صاحب کمال ہستیوں کی وجہ سے فارسی شاعری کو روز افزوں عروج حاصل ہو رہا تھا، ان کی قدردانی نے ہندوستان میں فارسی شاعری کی جڑیں مضبوط کر دیں، یہی وجہ ہے کہ غزالی اور عرفی جیسے باکمال شاعر جو اپنے وطن ایران میں خاطر خواہ حیثیت نہ حاصل کر سکے ہندوستان آئے، اور یہاں ان کی شاعری پر نکھار آ گیا اور ان کے نتائج فکر شعر و ادب کے شاہکار سمجھے گئے، صاحب "مآثر رحیمی" عبدالباقی نہاوندی نے ان اصحاب علم و دانش کی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر تنقید کرتے ہوئے اپنے تذکرے میں بہت کچھ لکھا ہے، عبدالرحیم خان خاناں کے دربار کے سلسلہ میں ان کی تحریر ذیل میں درج کی جا رہی ہے [۱]

| | |
|---|---|
| اکثر اعیانِ دولت و ارکانِ سلطنت | بادشاہ مرحوم کے اکثر اعیانِ دولت |
| بادشاہ مرحوم دست گرفتہ و تربیت | و ارکان سلطنت اسی کے تربیت یافتہ |
| کردہ وے اند ہر کہ از ولایت آمدہ | ہیں، جو بھی ولایت سے آتا، انہی کی |
| بندگی و مصاحبت ایشاں اختیار | نیازمندانہ ہم نشینی اختیار کرتا، چنانچہ خواجہ |
| می نمودہ، چنانچہ خواجہ ثنائی و مرزا | ثنائی، مرزا قلی، عرفی شیرازی و حیاتی، |
| قلی میلی و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی | گیلانی وغیرہ تمام شعراء و سخن سنج انہی |
| سائر مستعدان در خدمت او بودہ | کی خدمت میں تھے، اس زمانہ کے تمام |

۱ مآثر رحیمی (عبدالباقی نہاوندی) جلد ۳ ص ۲۹۳،

"اندو معتقدان و شعر سنجان ایں زماں را اعتقاد آن است کہ تازہ گوئی دریں زماں درمیانہ شعرا مستحسن است و شیخ فیضی، مولانا عرفی شیرازی وغیرہ باں روش حرف زدہ اند، بہ اشارہ و تعلیم وی بودہ"

ارباب سخن کا یہ اعتقاد ہے کہ تازہ گوئی جو اس زمانہ میں شعرا میں مستحسن سمجھی جاتی تھی اور جس میں شیخ فیضی، ملا عرفی شیرازی وغیرہ نے طبع آزمائی کی ہے، انہی کا فیض تھا،

شاہی سرپرستی اور فیاضی کے ساتھ دربار سے منسلک امرا اور روٴسا نے فارسی ادب اور شاعری کو جتنا فروغ دیا ہے، اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی، الگ الگ ان امرا کے درباروں میں بھی علم و ادب کی شمعیں جگمگا رہی تھیں، عبد الرحیم خانخاناں، ملک الشعرا فیضی، خان اعظم مرزا عزیز، خان زماں علی قلی خاں اور حکیم ابو الفتح گیلانی کی ادب نوازی اور علم پروری کے ڈنکے دور دور تک بج رہے تھے، ان امرا نے ایرانی شعرا کا دل کھول کر استقبال کیا اور ان پر زر و جواہر کی بارش کی، صرف خانخاناں کے دربار پر اگر نظر ڈالی جائے تو شعر و ادب کا مخزن نظر آئیگا، اس زمانہ کے مشہور شعرا ملا شکیبی، عرفی، نظیری، وغیرہ اسی کے دربار سے وابستہ تھے اور اسی کی سرپرستی کے طفیل گلشن ایران کے یہ پھول ہندوستان میں خوب مہکے اور اپنی خوشبو سے سارے ملک کو معطر کر دیا،

سرزمین ایران سے ہندوستان آکر مہکنے والے پھولوں کے اس گلدستے میں غزالی مشہدی بھی شامل ہے جو شاہ طہماسپ کی تنگدلی اور زیادتی سے تنگ آکر پہلے دکن آیا پھر وہاں سے خان زماں علی قلی خاں کی دعوت پر جونپور آیا اور خان زماں کے قتل کے بعد دربار اکبری سے منسلک ہو گیا، اور بعد میں "ملک الشعرا" کے بلند درجہ تک پہنچا تاریخی شواہد سے یہ واضح ہے، کہ



غزالی مشہدی نہ صرف دربار اکبری میں پہلی بار ملک الشعرا کے لقب سے نوازا گیا، بلکہ وہ پہلا شاعر ہے، جس سے ہندوستانی شعر و ادب کی تاریخ میں رسم ملک الشعرائی کی ابتدا ہوتی ہے، اس کے بعد فیضی، طالب آملی، قدسی، اور کلیم وغیرہ اس فہرست میں شامل ہوئے، غزالی مشہدی کی اسی تاریخی اور ادبی اہمیت کے پیش نظر اس مقالے میں اس کی زندگی، شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے

شعر و ادب کی دنیا جتنی حسین اور رنگا رنگ ہے اتنی ہی حوادث سے لبریز ہے، یہاں اگر کچھ عناصر ایسے نظر آتے ہیں، جنھوں نے اپنے ہمعصروں کو شہرت و ناموری کے بام تک پہنچانے کی کوشش کی تو ان کے بالکل برعکس ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے معاصرین کے ساتھ بے اعتنائی کی،

زیر نظر شاعر غزالی مشہدی بھی انہی شعرا میں شمار کیا جا سکتا ہے جنھیں اس کے ہمعصروں نے نظر انداز کیا، حد یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اس کے حالات بیان کرنے سے بھی دلچسپی نہ لی، لیکن تذکروں کے مبہم اشاروں کی روشنی میں قرائن و آثار کی مدد سے اس کی تصویر کشی کی کوشش کی جا رہی ہے،

مختلف تذکروں کی ورق گردانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ غزالی نام کے گیارہ شاعر گذرے ہیں، غزالی مجی[1]، غزالی طوسی[2]، غزالی طوسی دمحی الدین[3] غزالی ماوراء النہری[4]، غزالی یخنبک مشہدی[5]، غزالی سمرقندی[6]، غزالی رنظام محمود طاہر[7]، غزالی مروزی[8]، امیر آسلام غزالی[9]، غزالی تبریزی[10] اور غزالی مشہدی[11]؛ اسی آخر الذکر یعنی غزالی مشہدی کے بارہ میں تلاش و تفحص کے بعد جو معلومات فراہم ہوئے ہیں ان کو اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے،

غزالی کے معاصر تذکرہ نگاروں نے اس کے نام کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، متاخرین تذکرہ نگار

بھی سوائے کشن چند اخلاص کے سب اس سلسلے میں خاموش ہیں، اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار میں غزالی کا نام علی رضائی مشہدی لکھا ہے[1]، گو غزالی کے عہد سے تقریباً ۱۵۰ سال بعد لکھے جانے والے اس تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اخلاص کو غزالی کے اصل نام کے متعلق معلومات کس ذریعے سے فراہم ہوئیں، تاہم ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اخلاص ہی کے بیان پر اعتماد کریں،

غزالی کے عام حالات زندگی کی طرح اس کے سنہ ولادت اور والدین کے بارے میں بھی کسی تذکرہ نگار نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، مگر خود غزالی نے اپنے کلیات کے دیباچے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کے والدین کے نام یا ان کی اصلیت کے سلسلے میں مبہم معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ایک مفروضہ سنہ ولادت بھی مل جاتا ہے،

برٹش میوزیم، لندن میں محفوظ قدیم فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کرتے وقت کلیات غزالی کے ضمن میں غزالی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور یورپی محقق اور مستشرق ڈاکٹر ریو (Rieu) نے غزالی کا سنہ پیدائش بتانے کی کوشش کی ہے، ریو کی عبارت درج ذیل ہے[2]۔

"Malana Ghazali infors us ...... that hi has completed his 30th year in A.H 966, he must have been born about A.H 936"

مولانا غزالی نے ہم کو بتایا ہے کہ ...... انھوں نے اپنی عمر کے تیس سال ۹۶۶ھ میں پورے کئے، اس طرح ان کا سنہ پیدائش ۹۳۶ھ ہونا چاہیے،

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ۹۳۶ھ غزالی کا سنہ ولادت تسلیم کیا جا سکتا ہے، چونکہ اس سے زیادہ قرین قیاس اور مستند کوئی اور ذریعہ معلومات نہیں ہے،

غزالی کی جائے پیدائش کے بارے میں خود اس کے دونوں دواوین کے علاوہ دوسرے مستند اور معتبر ذرائع سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ صوبہ خراسان کے شہر مشہد مقدس میں

---

[1] تذکرہ ہمیشہ بہار، ذکر غزالی مشہدی (کشن چند اخلاص) [2] ریو کیٹلاگ (Rieu)، ٹیگور لائبریری نمبر ۲۵۰۲۳



پیدا ہوا تھا، تقی اوحدی نے اپنے تذکرے میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[1]:

"مولانا غزالی از مشہد مقدس مطہر رضویہ است" — مولانا غزالی مشہد مقدس.. تعلق رکھتے تھے،

غزالی نے بذات خود مشہد مقدس کی سرزمین پر اپنی پیدائش کی نہ صرف اطلاع دی ہے بلکہ اسے اس بات پر فخر ہے کہ وہ اس پاک اور مقدس سرزمین کا زائیدہ اور پروردہ ہے، جس کی عظمت و تقدیس کا سارا عالم معترف ہے، غزالی کا مندرجہ ذیل مطلع اس کے جذبات کا مظہر ہے[2]،

در کارگاہ چرخ اگر نیک و گر بدم — این دولتم بس است کہ از خاک مشہدم

میں دنیا میں خواہ نیک ہوں یا بد، میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ میں خاک مشہد سے تعلق رکھتا ہوں،

زیر بحث شاعر غزالی مشہدی کی تعلیم کس طرح ہوئی، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، وہ کن مدرسوں میں زیر تعلیم رہا، کتنی تعلیم حاصل کی، استاد کون کون تھے، اس کے طالب علم ساتھیوں میں خاص خاص کون تھے، یہ سارے سوالات تشنۂ معلومات ہیں، لیکن اس کی تعلیمی استعداد کی اس ناواقفیت کے باوجود ہم غزالی کی استعداد سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ اس کے گہرے علم اور فنی پختگی کا مظہر ہے، قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات، مثنویات، ترجیع و ترکیب بند، سب کے سب سنجیدہ اور متین عنوانات پر مشتمل اور علم و حکمت کے نادر نکات سے پر ہیں، حتی کہ اس کی ہجویات بھی اس کی مہارت فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں، مثنوی "نقش بدیع" اور "اسرار مکتوم" دونوں تصوف و معرفت کے باب میں ایک بیش قیمت

---

[1] عرفات العاشقین (تقی اوحدی)، ص ۲۰۰ جلد ۲ [2] مشہد مقدس کا قدیم نام "طوس" ہے، شاہنامۂ فردوسی میں بار بار "مشہد" کے بجائے طوس ہی نظم ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں ایک شعر بھی بہت مشہور ہے، ؎

ہر وزیر و شاعر و ملا کہ از طوس بود — چون نظام الملک، غزالی و فردوسی بود

اضافہ ہیں، اس کے علاوہ اس کے ان نثری کارناموں کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن کے ذریعہ غزالی مشہدی عوام و خواص سے متعارف ہونے سے لیکر ان کے درمیان معروف و مقبول ہونے کی منزل تک پہونچا اس کے ذہن کی رفعت پرواز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مروجہ علوم سے پوری طرح آگاہ تھا، غزالی کی علمی اور فنی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صاحب "ہفت اقلیم" امین احمد رازی نے لکھا ہے[۱]،

"مولانا غزالی بفضائل و کمالات صوری و معنوی محلی بود" — مولانا غزالی اپنے صوری و معنوی کمالات اور فضائل سے مزین تھے،

ملا بدایونی[۲] کے علاوہ سارے تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ غزالی کا شمار اپنے دور کے اول درجہ کے شعراء میں ہوتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر تذکروں میں اس کی شاعرانہ عظمت کا ذکر ملتا ہے، لیکن اس کی شاعری کی ابتداء کہاں، کیسے اور کب ہوئی؟ اس سوال کا جواب ذیل کی سطروں میں دیا جاتا ہے،

غزالی کی شاعری کی ابتداء کے بارہ میں صادقی کتابدار کا قول قابل غور ہے اس کی روشنی میں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے نہ صرف شعر و شاعری سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ کم عمری ہی میں باقاعدہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا، صاحب تذکرہ مجمع الخواص صادقی کتابدار کی تحریر ملاحظہ ہو[۳]،

"در اوائل عمر شاعر شناختہ شدہ و چوں نوری دندانی را ہجو گفتہ شہرتی بسزا یافت"؟ — وہ اوائل عمر ہی میں بحیثیت شاعر متعارف ہو چکا تھا، اور جب اس نے نوری دندانی کی ہجو کہی تو بہت شہرت پائی،

۱؎ تذکرہ ہفت اقلیم امین احمد رازی ص [illegible] ۲؎ منتخب التواریخ (ملا بدایونی) ص ۱۰۷، "اگرچہ در سخن او رتبہ عالی چنداں ندارد" ۳؎ تذکرہ مجمع الخواص (صادقی کتابدار) ص ۱۳۸،



تذکرہ نگار موصوف نے صاف طور بتایا ہے کہ وہ اوائل عمر ہی میں بحیثیت شاعر متعارف اور مشہور ہو گیا تھا، نوری دندانی کی مذکورہ ہجو بھی اسی جد و جہد کی مثال ہے،

غزالی کے دیباچہ دیوان آثار الشباب میں بھی کوئی واضح اطلاع اس کی ابتدائے شاعری سے متعلق نہیں ملتی البتہ اسکے دیباچہ دیوان میں نثری تحریر کے ضمن میں ایک قطعہ درج ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا تخلص غیر شعوری طور پر یا کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ بذات خود نہایت غور و فکر کے بعد منتخب کیا تھا، جو اس کے حسن ذوق کا ثبوت ہے[۱]،

غزالی شد غزل گوی شمارم — بوصف طلعت یوسف جمالاں

چو آہو بودہ ام از خورد سالی — سگ آہوی چشم خورد سالاں

غزالی بہر آں کردم تخلص — کہ دیدم مردمی را از غزالاں

مندرجہ بالا قطعہ سے واضح ہے کہ اس نے اپنا تخلص غزالی صرف اس لئے منتخب کیا کہ اسے انسانوں میں حسن خلوص اور لطیف احساس جمال کا شائبہ نظر آرہا تھا،

ظاہر ہے کہ غزالی نے جب اوائل عمر سے شاعری کی باقاعدہ ابتدا کر دی تھی کچھ ہی عرصہ میں اسے اپنے ہمعصروں میں شہرت بھی حاصل ہو گئی تھی، تو یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس نے اپنا تخلص بھی ابتدائے شاعری ہی میں منتخب کیا ہوگا، اس لئے کہ اس کے ابتدائی کلام کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شاعری کے آغاز سے انتہا تک وہ اپنے ایک ہی تخلص کو برابر استعمال کرتا آیا ہے تخلص کے بدلنے کی کوئی روایت نہیں مل سکی،

۱؎ دیوان آثار الشباب (غزالی مشہدی) ص ۱۵،

غزالی کے معاصر اور عہد قریب کے تذکرہ نویسوں نے اسکی ایران کے شاہی دربار سے وابستگی کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، صاحب مجمع الخواص کے بیان سے البتہ یہ اشارہ ملتا ہے، کہ وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے کسی نہ کسی حیثیت سے متعلق رہا تھا، اور پھر اسی کے خوف سے اُس نے ہجرت اختیار کی، چنانچہ اس سلسلہ میں بھی صادقی کتابدار کی درج ذیل عبارت بڑی اہم ہے،[1]

| | |
|---|---|
| درزمان شاہ مرحوم تہمت | شاہ مرحوم کے زمانہ میں ان پر الزام |
| زدہ ای اندیشید و مہاجرت | لگایا گیا، جس کے خوف سے انھوں |
| اختیار کردہ؟ | نے ہجرت اختیار کی، |

اس بیان سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ غزالی کا شاہ طہماسپ سے گہرا ربط تھا اور اس کا شمار دربار کے باعزت اور قابل قدر اشخاص میں ہوتا تھا، شاہ طہماسپ کے علاوہ ایران کے کسی امیر، وزیر یا رئیس کے دربار سے غزالی کی وابستگی کا اور کوئی حال نہیں معلوم، لیکن طہماسپ کے دربار سے اس کے تعلقات کے بارے میں ایک اور اہم شہادت ملتی ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیام ایران کے دوران وہ خاصے عرصہ تک شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ رہا، غزالی کی پیدائش یعنی ۹۳۶ھ سے لے کر ۹۵۸ھ تک ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی، لیکن ۹۵۸ھ میں شاہ طہماسپ کے حکم کی تعمیل میں خواجہ امیر بیگ کجی معزول و مجبوس وزیر کی ہجو اور سرزنش کرنے کے لئے اس نے سفر شیراز اختیار کیا، اس وقت غزالی کی عمر بائیس برس کی رہی ہوگی، اور چونکہ اس واقعہ کے فوراً بعد خود اس پر عتاب نازل ہوا اور مجبوراً اسے ترک وطن کرنا پڑا، اس لئے یہ زمانہ ایران میں اس کے فنی شباب کا زمانہ کہا جا سکتا

[1] مجمع الخواص صادقی کتابدار



ہے، اس عمر سے پہلے وہ کسی اور دربار سے وابستہ ہوا یا نہ ہوا، لیکن بائیس برس کی عمر کے بعد ہجرت کے وقت تک وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ رہا، اور اسی کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر عازم ہندوستان ہوا، آقای سعید نفیسی نے اپنی تالیف میں غزالی مشہدی کے حالاتِ زندگی اور امیر بیگ کجی کی سرزنش کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کی ہے آقای نفیسی کے الفاظ ملاحظہ ہوں،[1]

| | |
|---|---|
| درسال ۹۵۸ھ غزالی در اردوی | ۹۵۸ھ میں غزالی شاہ طہماسپ کے دربار |
| شاہ طہماسپ بودہ و شاہ او را روی | میں تھا، شاہ نے اس کو پیغام بھیجا کہ وہ |
| فرستاد کہ اشعارے در سرزنش وی | امیر بیگ کی ہجو میں کچھ اشعار کہے اس |
| بگوید، پس از آں کہ تہمت بد | کے بعد اس پر لادینیت کا الزام عائد |
| مذہبی خواستہ اند او را آزار دہند | کر کے اس کو اذیت دی گئی، جس کی وجہ |
| بہندوستان رفتہ" | سے وہ ہندوستان چلا گیا، |

شاہ طہماسپ کے دربار میں غزالی پر کیا گذری اور اس نے ترک وطن کا فیصلہ کیوں کیا، پھر ترک وطن کر کے کن مرحلوں سے گذرتا ہوا وہ اکبر کے دربار میں پہونچا، اور کس طرح "ملک الشعراء" کے درجہ تک ترقی کی، اس کی تفصیلی بحث آیندہ سطور میں ملاحظہ ہو،

جیسا کہ اس مقالہ کے آغاز میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جس دور سے زیر نظر شاعر غزالی مشہدی کا تعلق ہے، اس دور کے ایرانی حکمرانوں اور خصوصاً شاہ طہماسپ نے مذہب اور علمائے مذہب سے متاثر ہو کر شعرائے ایران کو یہ ترغیب دی تھی کہ وہ امراء و سلاطین کے بجائے صرف ائمۂ کرام کی شان میں قصائد لکھا کریں، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے

[1] نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی سعید نفیسی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۴۰۴،

والے معزول و معتوب ہوتے تھے۔ مذہبی شاعری کے علاوہ اور تمام دروازے بند ہوجانے کی وجہ سے شعرائے ایران میں گھٹن کا احساس بڑھنے لگا اور وہ ہندوستانی درباروں کی فیاضیوں کا ذکر سن کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے،

صاحب تاریخ عالم آرائے عباسی نے اس دور کے ایران کے بدلے ہوئے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے[1]،

"مجملاً در زمان دولت همایون آنحضرت خلائق وعباد اللہ تقوی و پرہیزگاری بہ نوعے مبالغہ فرمودند کہ قصہ خوانان معرکہ گیران از امورے کہ در وشائبہ لہو ولعب باشد ممنوع گشتہ"

مختصر یہ کہ اس عہد میں لوگوں میں تقویٰ و پرہیزگاری کا اس حد تک غلو تھا کہ قصہ خوانوں کے لئے ایسے امور کا بیان ممنوع قرار دیدیا گیا جن میں لہو لعب کا شائبہ بھی پایا جاتا تھا،

اسکندر بیگ ترکمان کی تحریر سے یہ بات طے ہو گئی کہ ایران کے ادبی حالات متزلزل ہونے کے سبب وہاں کے نامور شعرا بے قدری کا شکار ہو کر عازم ہندوستان ہو رہے تھے انہی نامور شعرا میں زیر بحث غزالی مشہدی بھی شامل ہے، جو اولاً تو شاہ طہماسپ کے لشکر سے وابستہ رہا اور شاہانہ فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتا رہا، لیکن بعد میں شاہ طہماسپ کی نگاہوں سے اتر گیا، اس کے لئے الحاد اور مذہبی بے اعتدالی کے الزام میں قتل کا حکم جاری ہو گیا، مجبوراً عراق سے براہ فارس آبی راستے سے وارد ہند ہوا۔ شروع میں کچھ دن دکن میں گذارے پھر شمالی ہند کا رخ کیا اور بعد میں دربار اکبری میں "ملک الشعراء" کے خطاب سے نوازا گیا،

ملا بدایونی مندرجہ واقعہ کے راوی ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں[2]،

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی، اسکندر بیگ ترکمان [2] منتخب التواریخ، بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ، ص ۱۷۰،



"چوں بتقریب الحاد و بے اعتدالی در عراق قصد کشتن او کردند آنجا بدکن فرار نمود پس بہند آمد ..... چند سال پیش خانزماں بود، بعد از اں بملازمت بادشاہی رسیدہ خطاب "ملک الشعراء" یافت"

جب عراق میں اسکے الحاد اور مذہبی بے اعتدالی کے الزام میں اس کے قتل کا ارادہ کیا گیا تو وہ وہاں سے دکن کو فرار ہو گیا اور ہندوستان آیا ... چند سال خانزماں کے حضور میں رہا، اس کے بعد ملازمت شاہی میں آکر ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا،

علاء الدولہ کامی نے نفائس المآثر میں اسی واقعہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے[1]،

"در فرصتی کہ ملا در دکن بودہ ..... علی قلی خاں یک ہزار روپیہ خرچ راہ جہت ملا فرستاد ..... بعد از قتل علی قلی خاں چنانکہ مذکور شدہ است باین درگاہ معلی آمدہ بعنایات بادشاہانہ سرفراز و ارجمند شدہ خطاب "ملک الشعراء" یافت"

جس وقت ملا دکن میں تھا ..... علی قلی خاں نے اس کو زاد راہ کے لئے ایک ہزار روپیہ بھیجا ..... علی قلی خاں کے قتل کے بعد جیسا کہ مذکور ہوا اس درگاہ معلی میں آیا، اور عنایات شاہی سے سرفراز ہو کر ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا،

سوال یہ ہے کہ ترک وطن کرتے وقت غزالی نے ہندوستان کی راہ کیوں اختیار کی اور سب سے پہلے دکن کا انتخاب کیوں کیا؟ اس سوال کا قطعی جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں غزالی کے حالات زندگی کی تفصیلات میں جانا ہوگا اور اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی حالات کا دقت نظر سے جائزہ لینا ہوگا، کہ کیا شاعر مذکور کے سامنے کوئی خاص

[1] نفائس المآثر، علاء الدولہ کامی، ٹیگور لائبریری، لکھنؤ ص ۳۶ - ۵۳۵:

مجبوری تھی، جس کے سبب اس نے اکبر اور امرائے اکبر کے درباروں کو چھوڑ کر دکن میں پناہ لی، یا یہ محض اس کی پسند تھی؟

مندرجۂ بالا سوال کو دو حصوں میں بانٹ کر پہلے نصف اول حصہ پر بحث کا آغاز کیا جاتا ہے کہ وہ کون سی وجہیں تھیں جن کی بنا پر غزالی نے دکن کا انتخاب کیا۔

ایران سے مراجعت کر کے ہندوستان آکر وقت غزالی نے دکن کو اپنی پہلی منزل کیوں بنایا اور دکن سے فوراً ہی شمالی ہند کا رُخ اختیار کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے وقت یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ ایران کی ادبی زبوں حالی کی وجہ سے وہاں کے بیشتر اہل دانش و شعراء وطن ترک کر کے ہندوستان آرہے تھے، چونکہ اس دورہ میں ایران سے ہندوستان کا سفر کرنے کے لئے سمندر سے زیادہ محفوظ اور کوئی راستہ نہ تھا، نیز ہندوستان کے بندرگاہ صرف دکن ہی میں تھے، اور ان کا فاصلہ بھی جنوبی ایران سے بہت کم تھا، اس لئے ایران سے یہاں آنے والے لوگ لازمی طور پر پہلے دکن ہی میں وارد ہوتے تھے، اور یہاں پہونچ کر وہ دکن ہی کی کسی ریاست یا دربار سے وابستہ ہو جاتے یا پھر دکن سے شمالی ہند کا رُخ کرتے، اور جہاں بھی ان کی قدر و منزلت ہوتی وہیں کے ہو رہتے، غزالی کا دکن آنا اسی لئے ناگزیر ہے، سمندری راستے سے اس کے ہندوستان سفر کرنے کی شہادت بھی ملتی ہے، صاحب "عرفات العاشقین" نے تحریر کیا ہے[1]،

گویند چوں از خراساں بعراق و
فارس آمد از آنجا رغبت بہند نمودہ
اندر راہ دریا بدکن افتاد؟

کہتے ہیں کہ جب وہ خراسان سے عراق و
ایران آیا تو وہاں سے ہندوستان کا رُخ
کیا اور سمندری راستے سے دکن میں وارد ہو گیا

[1] عرفات العاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۵۲۰، ج ۲،



تذکروں اور تاریخوں میں غزالی کے سفر ہند اور دکن میں قیام کا ذکر مختصراً ملتا ہے، لیکن دکن کے قیام کے زمانے کے حالات بالکل نہیں ملتے، ممکن ہے وہ دکن میں اپنے قدم نہ جما سکا ہو اور ناقدری سے پریشان ہو کر صوبہ دار جون پور کی دعوت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا ہو،

علی قلی خاں صوبہ دار جونپور نے غزالی کی دکن میں بیقدری کا حال سُن کر اسے ایک ہزار روپیہ اور ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا[1]،

ای غزالی بحق شاہ نجف
کہ سوی بندگان بیچوں آئی
چونکہ بیقدر بودہ آنجا
سر خود گیر و زود بیروں آئی

چونکہ علی قلی خاں بڑا لائق اور ذی علم شخص تھا اس نے اپنے فنی کمال کا مظاہرہ مندرجۂ بالا قطعہ میں بھی کیا ہے، قطعہ کا آخری مصرع ہے "سر خود گیر و زود بیروں آئی" — سر خود گیرد — غزالی کا سر — یعنی غین — برابر ایک ہزار — جیسا کہ آئندہ تحریر کیا جائیگا اس دعوت کو غزالی نے قبول کر لیا اور دکن سے فوراً شمالی ہند کا سفر کر کے جون پور کو اپنا مسکن بنایا، اور ایک مختصر مدت تک جون پور میں علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں کے ساتھ رہا، پھر علی قلی خاں کے قتل کے بعد اکبر کے دربار میں اس کی رسائی ہو گئی،

علی قلی خاں کے یہاں غزالی کی سرپرستی کا یہ واقعہ متعدد تذکروں میں درج ہے کہ اس نے ایک ہزار روپیہ، گھوڑے اور دوسرے تحائف بھیج کر اسے دکن چھوڑ کر جون پور آنے پر آمادہ کیا، اس سلسلہ میں منتخب التواریخ، عرفات عاشقین، ہفت اقلیم، مجمع النفائس، نفائس المآثر، ہفت آسمان نتائج الافکار، اور ید بیضا وغیرہ نے بیک زبان یہی بیان کیا ہے، جونپور پہونچنے کے بعد علی قلی خاں کی نوازش کے علاوہ اس کے بھائی بہادر خاں کی نظر عنایت بھی غزالی پر رہی، صاحب عرفات عاشقین

[1] منتخب التواریخ، ملا بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ، ص ۱۰۰،

تقی اوحدی نے لکھا ہے[1]،

"کتاب نقش بدیع بل گوہر شاہ وار وغیرہ اکثر در خدمت ایشاں شدن"

غزالی کی مثنوی "نقش بدیع" (جو کہ نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کے طرز پر اسی وزن میں ہے) کے سلسلے میں تذکروں میں مرقوم ہے کہ یہ ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے، غزالی نے مذکورہ مثنوی اپنے ممدوح اور سرپرست علی قلی خاں کی فرمائش پر لکھی تھی اور اس کے ہر شعر پر اس سے ایک اشرفی فی شعر کے حساب سے ایکہزار طلائی سکے انعام کے طور پر حاصل کیے تھے، صاحب ہفت اقلیم امین احمد رازی نے اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے[2]،

| | |
|---|---|
| غزالی سالہا بخانزماں بسر بردہ | غزالی برسوں خانزماں سے وابستہ رہا، اس |
| نقش بدیع را در آں زماں منظم آورد | زمانہ میں اس نے نقش بدیع نظم کی اور ہر شعر کے |
| مثنوی در عوض ہر بیتے یک طلائی صلہ یافت | عوض میں ایک اشرفی انعام میں پائی، |

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ خزانہ عامرہ میں ہفت اقلیم کے مندرجہ بالا اقتباس کی صداقت پر روشنی ڈالتے ہوئے اصل واقعہ کی تائید بھی کی ہے، اور نقش بدیع کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں جو علی قلی خاں کی مدح میں ہیں[3]،

| | |
|---|---|
| نقش بدیع کہ ہزار بیت است بر ہر | نقش بدیع ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے، |
| بیت یک اشرفی صلہ یافت، دریں | اس نے ہر شعر پر ایک اشرفی انعام پایا |
| کتاب مدح خانزماں میکند و می گوید | اس کتاب میں وہ خانزماں کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے |
| خان زماں صاحب امن و اماں | پیش رو مہدی آخر زماں |

[1] عرفات عاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۵۰ ج ۲ [2] ہفت اقلیم، امین احمد رازی ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۱۷۰ [3] خزانہ عامرہ آزاد بلگرامی ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۳۶۴،



| | |
|---|---|
| آنکہ خرد یافتہ منشور ازو | چشمۂ خورشید سخن نور ازو |
| نے بسخن از ہمہ کس بیشتر | در ہمہ فن از ہمہ کس بیشتر |
| داد گر حشمت تو جاوید باد | ظل تو ہمسایۂ خورشید باد |
| بخت کہ القاب تو پر زر نوشت | تیغ ترا سد سکندر نوشت |

مثنوی نقش بدیع کے مندرجہ بالا اشعار سے اس بیکراں محبت اور غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے، جو غزالی مشہدی کو اپنے ممدوح اور سرپرست علی قلی خاں کی ذات سے تھی، اس ذاتی دلچسپی اور وابستگی کے پیچھے غزالی کے ذہن و دل میں جو جذبہ پوشیدہ ہے، وہ مذکورہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے، اس نے اپنے ممدوح کو نمایاں اور منفرد ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، اور اس کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت سے قریب اور کذب و ریا سے بہت دور ہے، وہ علی قلی خاں کی سرپرستی اور نوازش سے مطمئن تھا،

تذکروں اور تاریخی کتابوں میں اس دور کے حالات کو بہت مختصر اور مبہم ہیں، لیکن باایں ہمہ خانزماں کے دربار سے وابستگی، پھر اس کے قتل کے بعد آخر عمر تک اکبر کے دربار سے تعلق یقینی ہے،

آئین اکبری مصنفہ ابو الفضل مرتبہ سر سید احمد خاں میں غزالی کے حالات کے بارہ میں حاشیہ پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، اس سے مذکورہ بالا امر کی تصدیق ہوتی ہے، ملاحظہ ہو[1]،

| | |
|---|---|
| بالجملہ مولانا بجونپور آمد، مدتے بخدمت | خلاصہ یہ کہ مولانا جونپور آئے، ایک |
| خانزماں ماند بعد ازاں کہ خانزماں | مدت تک خانزماں کے ساتھ وابستہ رہے پھر ان کے |
| بقتل رسید او بحضور شاہی رسید؛ | قتل کے بعد دربار شاہی میں رسائی حاصل کی؛ |

[1] آئین اکبری، ابو الفضل، ندوہ لائبریری لکھنؤ ص ۱۷۲

اس سلسلہ کی سب سے واضح جامع اور مختصر تحریر ملا بدایونی کی ہے، جس کے ذریعے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ غزالی اکبر کے دربار میں پہونچنے کے بعد خطاب ملک الشعراء سے نوازا گیا، صاحب منتخب التواریخ کے الفاظ درج ذیل ہیں۔[1]

| | |
|---|---|
| چند سال پیش خان زماں بود بعد از آں | چند سال خان زماں کے حضور میں |
| بملازمت بادشاہی رسیدہ خطاب | رہا اس کے بعد دربار شاہی میں پہنچکر |
| ملک الشعراء یافت، | ملک الشعراء کا خطاب پایا، |

اسی سلسلے میں تذکروں اور تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزالی تیموری حکومت کے دور میں سب سے پہلے ملک الشعراء کے خطاب سے بہرہ مند ہوا، ابوطالب محمد بن محمد اصفہانی نے تذکرہ "خلاصۃ الافکار" میں ملا غزالی مشہدی کے حالات زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے، جس کو ہندوستان میں سب سے پہلے خطاب ملک الشعراء سے موسوم کیا گیا، ابوطالب کے الفاظ درج ذیل ہیں۔[2]

"اول کسی است کہ در ملک ہند بملک ملک الشعرائی موسوم گردید۔"

غزالی کی اخیر عمر کا وہ حصہ جو مغل دربار میں گذرا اس کی زندگی کا زریں دور قرار دیا جا سکتا ہے، مغل دربار میں اس کی ایسی قدر و منزلت ہوئی اور اس کی خدمات کا اتنا اعتراف[3] کیا گیا جو کسی صاحب کمال کے لئے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس زمانہ میں غزالی نے پوری توجہ کے ساتھ اپنے ادبی سرمایہ میں اضافہ کی کوشش کی اور بحث و مباحثہ میں شریک ہو کر اپنی ذہانت و فطانت کی بنا پر اپنے ہمعصروں پر فوقیت حاصل کی، دربار اکبری کے ایک

[1] منتخب التواریخ، بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ، ص ۱۷۰،

[2] خلاصۃ الافکار، ابوطالب اصفہانی، خدا بخش لائبریری پٹنہ،



امیر قلیچ خاں المتخلص بہ الفتی[1] سے غزالی کے جو ادبی معرکے ہوئے اور ہجویات کے جو باہمی تبادلے ہوئے، اُن میں غزالی نے اپنے حریف کو شکست دے کر اکبر کی نگاہوں میں اپنا مقام بنا لیا، اکبر نے ان مباحث میں غزالی کی حاضر دماغی اور ذہانت کا اعتراف کیا، در اصل اکبر کے دربار میں اس قسم کے ادبی مباحثے اور معرکے برابر ہوتے رہتے تھے، اور ایسے مباحثوں میں حصہ لینے کے لئے بادشاہ کی جانب سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی،

غزالی ان معرکہ آرائیوں میں کامیابی سے سرشار ہو کر لطف و مسرت اور راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن کبھی کبھی ماحول میں تنہائی کا احساس بھی ہوتا بالآخر فرشتۂ اجل نے دستک دی، کہتا ہے[2]۔

جاں دادم و فارغ شدم از محنت ہجراں — یعنی کہ شبہائے دگر بہتر ازامشب

اسی مضمون کے ایک اور شعر میں بھی غزالی نے اپنی خوش حال زندگی اور وفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔[3]

چراغ عمر نشاندم بیک نفس دم مرگ — کہ بہتر است نشاندن بوقت خواب چراغ

اگرچہ ہندوستان اور ایران کے آسمان ادب پر چوالیس[4] برس سے جھلملانے والا درخشندہ چراغ بجھ گیا اور دنیا کی آنکھیں اس کی شخصیت کی رنگینی اور ذہانت و ذکاوت کے واقعات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئیں، لیکن اس کے کلام کی درخشندگی آج تک دنیائے شعر و ادب کے لئے مشعل راہ بنی ہوئی ہے، تذکرہ نویسوں کی ایک بڑی تعداد اس امر پر متفق ہے کہ غزالی کی موت جمعرات ۲۷ رجب ۹۸۰ھ کو احمد آباد گجرات میں ہوئی، اور بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے اس کی تدفین موضع سرکیج کے اس قبرستان میں

[1] عرفات عاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۵۲۴ (ج ۲)

ہوئی جہاں شاہی خاندان کے لوگ اور مشایخ کبار کی تدفین عمل میں آتی تھی، متعدد تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی موت پر فیضی، قاسم کاہی اور میر اسیری نے قطعات تاریخ لکھے تھے، صاحب منتخب التواریخ نے غزالی کی وفات اور اس کی تدفین کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان دیا، قاسم کاہی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ بھی منتخب کی تحریر میں شامل ہے[1]،

| | |
|---|---|
| وفاتش در شب جمعہ بیست وہفتم | اس کی وفات اچانک ، ۲۷ رجب ۹۸۰ھ |
| ماہ رجب در سنہ نہصد و ہشتاد (۹۸۰) | بروز جمعرات احمد آباد میں ہوئی، شاہ |
| بیچارہ دفعتہً در احمد آباد واقع شد و بندگان | وقت نے حکم دیا کہ اس کو سرکھیج کے اس |
| بادشاہی حکم فرمودند تا او را در سرکھیج | قبرستان میں دفن کیا جائے جو مشائخ کبار |
| کہ مقبرۂ مشائخ کبار و سلاطین سابقہ | اور گذشتہ سلاطین کا مدفن ہے، قاسم |
| است دفن کردند و قاسم ارسلان | ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ قطعۂ |
| از زبان قاسم کاہی ایں تاریخ گفت | تاریخ کہا |

قطعہ

| | |
|---|---|
| بود گنجی غزالی از معنی | مدفنش خاک پاک سرکھیج است |
| بعد یک سال سال تاریخش | احمد آباد خالد سرکھیج است |

غزالی کی موت سے متاثر ہو کر اس کے ایک ہمعصر شاعر میر اسیری نے جو قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا وہ بھی درج ہے، میر اسیری کے قطعۂ تاریخ سے بھی مادہ نو سو اسی (۹۸۰) ہی نکلتا ہے، جس سے تذکرۂ مذکورہ کے گذشتہ بیان کی پوری طرح تصدیق ہو جاتی ہے، اسیری کا قطعہ منقولہ نفائس المآثر درج ذیل ہے[2]،

[1] منتخب التواریخ بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۱۰۱، [2] نفائس المآثر علاء الدولہ کامی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۵۳



| | |
|---|---|
| غزالی رفت چوں بیروں ز عالم | ز چشم اہل معنی جوی خوں رفت |
| نشان جستم ز تاریخش خرد گفت | ز کان فضل یک گوہر بدوں رفت |

قطعہ تاریخ کے آخری مصرعہ سے مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اسیری نے کہا ہے، ع

ز کان فضل یک گوہر بدوں رفت

"زکان فضل" کے اعداد نو سو اکیاسی (۹۸۱) ہوتے ہیں اور اگر شاعر کی ہدایت کے مطابق صنعت تخرجہ کا استعمال کر کے اس میں سے ایک عدد گھٹا دیا جائے تو مادۂ تاریخ نو سو اسی (۹۸۰) بچتا ہے، اس فیصلہ کی تصدیق کے لئے ذیل میں چند تذکروں کے نثری اقتباسات اور فیضی کا لکھا ہوا وہ قطعہ تاریخ وفات نقل کیا جا رہا ہے، جس میں اس نے غزالی کی وفات کا سنہ نو سو اسی (۹۸۰) قرار دیا ہے، غزالی کے دور سے قریب ترین تذکروں میں عرفات العاشقین بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، غزالی کی وفات کے سلسلہ میں اس کی تحریر درج ذیل ہے[1]،

"شیخ فیضی نسبت اعتقاد و ارادت بخدمت وی بسیار داشتہ و تاریخ فوتش گفتہ است"

| | |
|---|---|
| تسدۂ نظم غزالی کہ سخن | ہمہ از طبع خدا داد نوشت |
| عقل تاریخ وفاتش بدو طرد | سنہ نہصد و ہشتاد نوشت (۹۸۰ھ) |

مندرجۂ بالا تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی عقیدت اور ارادت کے پیش نظر فیضی نے غزالی کی وفات سے متاثر ہو کر جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے، اس کے آخری مصرعہ "سنہ نہصد و ہشتاد" کے ذریعہ غزالی کے سنہ وفات نو سو اسی ہجری (۹۸۰) پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، اور مذکورہ سنہ کو حرف آخر قرار دیدیا ہے،

[1] عرفات عاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۵۲۰ ج ۲

عجیب اتفاق ہے کہ مذکورۂ بالا معتبر تاریخی شواہد کے باوجود "ریاض العارفین" اور "آتشکدہ" میں درج ہے کہ غزالی کی وفات آگرے میں ہوئی لیکن گذشتہ صفحات میں متعدد معتبر اور باوثوق ذرائع سے یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ غزالی کی موت اس وقت واقع ہوئی تھی جب وہ شاہی قافلے کے ساتھ گجرات جارہا تھا، اور اس کی موت کے بعد شہنشاہ اکبر نے یہ حکم دیا تھا کہ اسے سرکھیج کے شاہی قبرستان میں دفن کیا جائے، جہاں عام طور پر شاہی خاندان کے لوگ سپرد خاک کئے جاتے تھے، جب غزالی کی موت احمد آباد گجرات کے سفر کے دوران ہوئی تو پھر اس کی جائے وفات آگرہ بتانا غلط نگاری نہ سہی سہو قلم تو ہے ہی۔

---

## سلسلۂ شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ اس کے تدریجی ارتقاء اور عہد بعہد کے ممتاز فارسی شعراء کے حالات اور اُن کے کلام پر تبصرہ پر مولانا شبلی کی مقبول ترین کتاب جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے،

شعر العجم حصہ اول: عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ اور انکے کلام پر تنقید و تبصرہ قیمت ۹۵-۱۰

" دوم: خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۷۵-۸

" سوم: فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۲۵-۶

" چہارم: شاعری کے تمام انواع و اقسام و اصناف میں مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بسیط تبصرہ قیمت ۴۰-۹

" پنجم: عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ قیمت ۸۰-۷

"منیجر"



# حافظ ابوبکر احمد بن علی مروزی اور انکی مسند

از مولوی بدر الزماں صاحب نیپالی مرکزی دار العلوم بنارس

علم حدیث کی تاریخ میں دوسری اور تیسری صدی ہجری کا زمانہ بہت اہم ہے، اس دور میں بڑے بڑے محدثین اور ارباب فن پیدا ہوئے، حدیث کی اکثر امہات کتب اسی زمانہ کی یادگار ہیں، اس دور میں حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں فقہی ابواب کے تحت بھی حدیثیں جمع کی گئیں اور صحابہؓ کے ناموں کی ترتیب پر بھی، اس دوسرے طریقہ پر جو کتابیں مرتب کی گئیں ان کو مسند کہا جاتا ہے، مسانید کی ترتیب و تدوین بھی دو طریقوں پر کی گئی ہے، اول یہ کہ بہت سے صحابۂ کرام کی مرویات یکجا مرتب کی گئیں، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص صحابی کی حدیثوں کا ایک علٰحدہ مجموعہ مرتب کیا گیا،

تمام صحابۂ کرام میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جو اہمیت ہے، ظاہر ہے اس بنا پر ان کی جانب بھی محدثین کرام نے توجہ کی، امام ابو اسحٰق ابراہیم بن سعید جوہری بغدادی (م سنہ ۲۴۴ھ) نے اس کام کو زیادہ بالغ نظری سے انجام دیا تھا، ابن عماد حنبلی متوفی سنہ ۱۰۸۹ھ نے شذرات الذہب میں ان کی اس کتاب کا ذکر کیا ہے[1] لیکن اب وہ نایاب ہے، مگر ان کے قریب العہد محدث حافظ ابوبکر مروزی نے بھی اسی انداز پر حضرت ابوبکرؓ کی حدیثیں جمع کی تھیں، خوش قسمتی سے چند سال ہوئے اُن کی یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو گئی،

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۱۳ مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۵۰ھ

اس کی اہمیت کی بنا پر اس کے مقدمہ اور تذکرہ و تراجم کی بعض کتابوں کی مدد سے اسکی خصوصیات تحریر کی جاتی ہیں، اور شروع میں مصنف کے جو حالات تلاش کے بعد معلوم ہو سکے، ان کو پیش کیا جاتا ہے،

**نام ونسب** احمد نام، ابوبکر کنیت اور سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ احمد بن علی بن سعید بن ابراہیم[1]

**پیدائش** مورخین اور ارباب سیر نے ان کے سنہ ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر صحیح قول کے مطابق ان کی وفات ذی الحجہ سنہ ۲۹۲ھ میں ہوئی، ان کے شاگرد ابن المفسر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت وہ لگ بھگ نوے سال کے تھے[1]، اس لحاظ سے وہ سنہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے،

**خاندان ووطن** امام ابوبکر مروزی اور اموی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن مرو کا مردم خیز شہر ہے[1]، خطیب بغدادی کا یہ بیان کہ "مجھ سے ایک قابلِ اعتماد اور واقف کار شخص نے بیان کیا کہ وہ بغداد کے رہنے والے تھے"[2] تو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ ابوبکر مروزی کی ابتدائی زندگی مرو میں گذری، لیکن جب وہ سن شعور کو پہونچے اور تحصیل علم وفن کی طرف متوجہ ہوئے تو بغداد میں جو اس زمانہ میں علوم وفنون کا مرکز تھا، بود وباش اختیار کر لی، وہ نسلاً اموی نہیں تھے، ولا کے تعلق سے اموی کہلاتے ہیں،

**اساتذہ وشیوخ** انھوں نے اپنے زمانہ کے متعدد اہلِ علم سے استفادہ کیا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وکان مکثراً شیوخاً وحدیثاً[3] (یعنی) ان کے شیوخ اور مرویات کی تعداد

۱؎ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۲ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۰۳ ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۲



تذکرہ نگاروں نے صرف مشہور اساتذہ کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں،

یحیٰی بن معین، احمد بن حنبل، علی بن مدینی، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن بشار[1]،

**تلامذہ** چند تلامذہ کے نام یہ ہیں،

ابو عبد الرحمٰن نسائی، ابوعوانہ یعقوب بن اسحٰق، سلیمان بن احمد طبرانی، ابو احمد عبد اللہ بن محمد مغنر، امام نسائی ان کے خاص تلامذہ میں تھے، ان سے بہت سی روایتیں کی ہیں، اپنی سنن میں انکے واسطے سے امام مالک سے بھی روایت کی ہے[2]،

**حدیث میں درجہ ومرتبہ** ان کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت پر علمائے حدیث کا اتفاق ہے، خطیب بغدادی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو خود بھی ثقہ قرار دیا ہے اور امام نسائی کے حوالہ سے بھی ان کی توثیق نقل کی ہے، ذہبی نے انھیں علم وفن کا خزانہ قرار دیا ہے، ابن عماد ان کی ثقاہت کے معترف ہیں[3]،

ان اقوال سے علم حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، احادیث کی روایت اور جمع وتدوین ان کا دل پسند مشغلہ تھا، گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود وہ ہمیشہ حدیث کی خدمت ذوق وشوق سے انجام دیتے تھے، اس اشتغال وانہماک کی بنا پر ان کے پاس حدیثوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، اوپر حافظ ابن حجر کا یہ بیان نقل ہو چکا ہے کہ اساتذہ کی طرح ان کی حدیثوں کی تعداد بھی زیادہ تھی،

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۳۵ ۲؎ ایضاً وتہذیب التہذیب ص ۶۲ وتاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۵۰۲،

۳؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۱ جدید اڈیشن شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۰۹،

**فقہ** حدیث کی طرح فقہ میں بھی ممتاز تھے، فقہی مسائل پر اچھی نظر رکھتے تھے، اسی لئے حمص میں قاضی مقرر کئے گئے،

**دوسرے علوم** حدیث و فقہ کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم میں بھی کافی درک رکھتے تھے، لغت میں ان کی مہارت کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے،

**درس و تدریس** درس و تدریس سے بھی ہمیشہ دلچسپی رہی، چالیس پینتالیس ۴۵ سال تک مسند درس پر متمکن رہ کر حدیث کے طلبہ اور علم کے شائقین کی تشنگی بجھاتے رہے،

**عہدہ قضا** وہ مدتوں قضا کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، پہلے حمص کے قاضی مقرر کئے گئے اور آخر میں دمشق میں عہدۂ قضا پر مامور کئے گئے، انھوں نے قضا کے فرائض ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ انتقال کے وقت تک اس منصب پر فائز رہے،[1]

**وفات** مشہور روایت کے مطابق ۲۹۲ھ میں وفات پائی ان کے مشہور شاگرد ابن المقری کا بیان ہے کہ چہارشنبہ کے روز انتقال کیا، اور ۲۵ ذی الحجہ کو تجہیز و تکفین کی گئی،[2] بعض مورخین نے ۲۹۵ھ بھی سنہ وفات تحریر کیا ہے،[3]

**تصنیفات** پہلے بتایا جا چکا ہے کہ احادیث کا درس و تدریس اور ان کی جمع و تدوین مروزی کا خاص مشغلہ تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ رہی ہوگی، مگر غالباً قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہیں، راقم کو جن کتابوں کا پتہ چل سکا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) کتاب العلم (۲) مسند عثمانؓ (۳) مسند عائشہؓ (۴) کتاب الجمعہ۔

شعیب ارناؤوط نے جن کی کوشش سے مسند ابی بکر صدیقؓ شائع ہوئی ہے، لکھا ہے کہ

[1] تذکرة الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۱ جدید اڈیشن [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۶۲ [3] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۴۰۵،



"کتاب الجمعہ کا قلمی نسخہ المکتبۃ الظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے، اس کے راوی کا نام ابو طاہر سلفی ہے، انھوں نے مرشد بن یحییٰ بن القاسم سے اور انھوں نے ابو القاسم علی ابن محمد الفارسی سے اور انھوں نے عبد اللہ بن الناصح سے اور ابو عبد اللہ نے مصنف سے اس کی روایت کی ہے[1]"

(۵) **مسند ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ** جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں صرف خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیان کردہ حدیثیں درج ہیں مروزی نے ایک سو چالیس ۱۴۰ حدیثیں نقل کی تھیں، لیکن ان کے خاص شاگرد اور اس مسند کے راوی ابن المقری نے صرف دو ۲ حدیثوں کا اضافہ کیا ہے، اس طرح اس میں منقول حدیثوں کی تعداد ایک سو بیالیس ۱۴۲ ہو گئی شعیب ارناؤوط کا بیان ہے:۔

"مسند مروزی کا جو مخطوطہ دمشق کی لائبریری "المکتبۃ الظاہریۃ العامرہ" میں موجود ہے اس میں چوالیس ۴۴ ورق ہیں، ہر صفحہ میں سولہ سطریں ہیں، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں، لیکن غالب گمان ہے کہ اس کو علی بن بقا وراق مصری، (م ۴۴۳ھ) نے ۴۴۲ھ یا اس سے پہلے لکھا تھا، کیونکہ جو سماعات مسند کے آخر میں ملحق ہیں وہ علی بن بقا کی قرأت سے ہیں اور سماعات کے آخری صفحہ پر ۴۴۲ھ تحریر ہے[2]

امام مروزی سے ان کے لائق شاگرد ابن المقری الدمشقی م ۳۶۵ھ نے اور ابن المقری سے ابو القاسم علی بن محمد (م ۴۴۲ھ) نے اس کی ہے[3]،

حافظ احمد بن علی مروزی کا مقصد یہ تھا، کہ اس مسند میں حضرت ابوبکرؓ سے روایت کرنے والے تمام بزرگوں کی سب حدیثیں یکجا کر دیں، اس بنا پر بعض کم درجہ کی حدیثیں بھی اس میں شامل ہو گئی ہیں۔ اور کہیں کہیں معمولی فرو گذاشتیں بھی ہیں، جیسے حضرت عثمانؓ، حضرت

[1] مقدمہ مسند ابی بکر الصدیق ص ۱۲ [2] مقدمہ مسند [3] ایضاً ص ۷،

حضرت انس بن مالکؓ، حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اور حضرت قبیصہ بن ذویبؓ کی حدیثیں دو جگہوں پر ہو گئی ہیں،

حافظ مروزی نے پہلے صحابہ کی روایتیں نقل کی ہیں، اس کے بعد تابعین کی مرویات جمع کئے ہیں علاوہ سند کی جانب بھی پوری توجہ کی ہے، چنانچہ بعض روایتوں میں صرف چار ہی راوی ہیں، بعض روایتوں کے راوی اگرچہ دوسرے ہیں، لیکن چونکہ ان کے اندر کہیں نہ کہیں درمیان میں حضرت ابوبکرؓ کا ذکر ہے اس لئے ان کو بھی مسند میں داخل کر لیا گیا ہے، مثلاً اس مجموعہ کی چوہترویں روایت یہ ہے،

| | |
|---|---|
| حدثنا احمد بن علی قال حدثنا | .. .. .. .. .. .. .. .. .. |
| بشار قال حدثنا جعفر قال | .. .. .. .. حضرت انسؓ سے روایت |
| وقال ثابت عن انسؓ قال النبی صلی اللہ | ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت |
| علیہ وسلم لابی بکر یا ابابکر ما ظنک | ابوبکرؓ سے فرمایا اے ابوبکرؓ تمہارا ان دو |
| باثنین اللہ ثالثہما | شخصوں کی بابت کیا خیال ہے، جن کا |

اس حدیث میں مروزی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف چار واسطے ہیں اس لئے یہ رُباعی حدیث ہوئی،

ابن المقسم نے جن دو روایتوں کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے پہلی کو مسند میں داخل کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ یہ روایت اس طرح ہے:۔

| | |
|---|---|
| عن سلمۃ بن نبیط عن ابیہ | حضرت نبیطؓ سے روایت ہے کہ وہ بیان |
| رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب | کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرفہ میں |
| بعرفۃ علی جمل احمر، | ایک سرخ اونٹ پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا |

نہ اس حدیث کی سند میں حضرت ابوبکر کا نام آیا ہے؛ اور نہ اس کے متن ہی میں کہیں ان کا ذکر ہے، ممکن ہے یہ کسی اور سند سے مروی ہو، اور اس میں حضرت ابوبکرؓ کا ذکر ہو یا یہ کسی دوسری جگہ اسی سند سے حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہو لیکن ابن المقسم نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے اور نہ مسند کے فاضل مرتب ہی نے اس کی کوئی نشان دہی کی ہے،



اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق نفس مسند سے تھا، آخر میں اس کے مطبوعہ اڈیشن کے متعلق بھی بعض باتیں قابل ذکر ہیں،

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ "المکتب الاسلامی" دمشق کے فاضل رفیق علامہ شعیب ارناؤوط نے جو کئی اور قدیم قلمی کتابوں کو ترتیب و تحشیہ کے ساتھ شائع کر چکے ہیں، مسند ابی بکرؓ کو جدید طرز پر مرتب کر کے شائع کیا ہے، ان کے پیش نظر دمشق کی لائبریری "المکتبۃ الظاہریہ" کا قلمی نسخہ تھا، شروع میں ان کے قلم سے ستائیس ۲۷ صفحہ کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، جو مصنف کے حالات و سوانح اور مسند کے راویوں ابن المقسم اور ابوالقاسم فارسی کے مختصر حالات پر مشتمل ہے آخر کے تیرہ ۱۳ صفحوں میں "سماعات" میں مذکور بعض ناموں کا بھی مختصر تذکرہ ہے قلمی نسخہ کے چار صفحوں کا عکس بھی دیا گیا ہے، پوری کتاب ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، مرتب کا خود بیان ہے کہ:۔

"مجھے مسند ابی بکر صدیقؓ کی نشر و اشاعت اور اس کو موجودہ علمی و تحقیقی انداز کے مطابق پیش کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، چنانچہ میں نے اس کی عبارتوں کے ضبط و تصحیح کا کام کیا اور حدیثوں پر نمبر لگائے، اور تعلیقات کے اندر ہر حدیث کی صحت و سقم سے بحث کی، اس مسند کی حدیثوں کی تخریج اس طرح کی گئی ہے، کہ کتب حدیث کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ کے اندر جہاں کہیں یہ آئی ہیں، ان کے حوالے دیدیے ہیں، حسب ضرورت رواۃ پر بھی کلام کیا گیا ہے اور جو حدیثیں ضعیف سندوں سے مروی ہیں، ان کے شواہد و متابعات نقل کر دیئے گئے ہیں، اس سے ان کی صحت و قوت

ظاہر ہو گئی ہے، مغلق اور غیر المفہم مباحث اور مشکل الفاظ کی تشریح اور تضاد کو بھی رفع کیا گیا ہے۔ حدیثوں اور راویوں کی حروف تہجی کے اعتبار سے ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے، تاکہ مراجعت اور استفادہ میں آسانی ہو (مقدمہ مسند ابی بکر الصدیقؓ)

گو فاضل مرتب نے مسند کی ترتیب و تحشیہ میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے، تاہم بعض امور سے انھوں نے صرفِ نظر کر لیا ہے، جیسے بعض توضیح طلب راویوں کے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور حدیثوں کی تخریج میں محض ایک یا چند کتب حدیث کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے، اگر وہ تمام مصادر کا ذکر کر دیتے تو حدیث کی قوت و ضعف کا معاملہ زیادہ صاف ہوجاتا، الفاظ و لغات کی تشریح کے ضمن میں مستند ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، حواشی میں بڑے اختصار سے کام لیا گیا ہے، اگر کسی قدر مزید تفصیل و توضیح سے کام لیا جاتا تو یہ تعلیقات و حواشی مسند ابی بکرؓ کی جامع شرح بن جاتے، ان کوتاہیوں کے باوجود فاضل مرتب اس نادر مسند کی اشاعت پر اہل علم خصوصاً حدیث کے طلبہ و اساتذہ کے شکریے مستحق ہیں۔

---

## تذکرۃ المحدثین

اس میں صحاح ستہ کے ائمۂ احادیث کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام دارمی، امام ابن جارود، امام ابو بکر بزار، امام ابن خزیمہ، امام ابو جعفر طحاوی کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، شروع میں مولانا شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے قلم سے مقدمہ ہے۔ ضخامت ۴۴۰ قیمت ۱۳/-

مرتبہ:- ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ — منیجر



# وفیات

## مفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہاں پوری

از
محمد نعیم صدیقی ندوی، ایم اے علیگ

افسوس کہ گذشتہ اپریل کی ۲۹ر تاریخ کو علم و عمل اور فضل و کمال کی ایک اور شمع فروزاں گل ہو گئی، مولانا مفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہاں پوری نے ۹۶ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم اس عہد میں اگلی صحبتوں کی چند بقیۃ السلف یادگاروں میں سے تھے، وہ اتباع سنت، تبحر علم، وسعتِ نظر، طہارت و تقویٰ، زہد و ورع اور کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر میں یگانۂ عہد تھے، دارالعلوم دیوبند کی مسند درس و افتا ان کے فیضانِ کمال سے ایک عرصہ تک بارونق رہی ہے، اور سیکڑوں تشنگانِ علم ان کے منبع فیض سے سیراب ہوئے، وہ بلاشبہہ معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علم کی ایک نادر مثال تھے، ہر مجلس و محفل میں یکساں ان کی قدر و منزلت تھی، حدیث کے ساتھ فقہ کے جزئیات پر ان کی وسعتِ نظر مسلّم خیال کی جاتی تھی،

مفتی مہدی حسن مرحوم سنہ ۱۳۰۰ھ میں شاہجہاں پور کے ایک محلہ ملا خیل میں پیدا ہوئے، عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سید کاظم حسن اور بڑے بھائی سے حاصل

کی، بارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوگئے، پھر وطن ہی کے مدرسہ
عین العلم میں شیخ عبد الحق (خلیفہ مجاز مولانا رشید احمد گنگوہی) اور مفتی کفایت اللہ دہلوی
جیسے اکابر اساتذۂ فن سے صرف و نحو اور فقہ کی تحصیل کی، پھر جب مفتی کفایت اللہ صاحب
مدرسہ امینیہ دہلی چلے گئے تو مرحوم کے والد نے ان کو بھی وہیں بھیج دیا، جہاں انھوں
نے ملک کے منتخب اصحاب کمال کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرکے فقہ، ادب، منطق، فلسفہ،
اصول فقہ اور حدیث وغیرہ علوم میں دسترس اور کمال بہم پہونچایا، سنہ ۱۳۲۶ھ میں کتب
درسیات سے فراغت پائی اور مدرسہ امینیہ ہی میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے، جامع
ترمذی اور صحیح بخاری کا درس شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بھی لیا، پھر مدرسہ اشرفیہ
راندیر (سورت) میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور وہاں سات سال تک حدیث کی
امہات کتب کے علاوہ معقولات کا درس دیا، اس کے بعد راندیر ہی کے مدرسہ محمدیہ میں
چار سال تک شیخ الحدیث کے منصب پر مامور ہوکر صحاح ستہ کی تدریس اور کامل
تیس سال تک افتا کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ سنہ ۱۳۶۷ھ میں ارباب دار العلوم
دیوبند کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور وہ وہاں تادم واپسیں صدر المفتین کے اعلیٰ
منصب پر فائز رہے، اس طرح تقریباً چالیس سال تک انھوں نے ایک جید مفتی
کی حیثیت سے بے شمار لوگوں کو مستفیض کیا، وہ فتاویٰ کے جوابات مختصر لیکن مدلل
دیتے تھے،

مرحوم پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، اور انھوں نے حرمین
میں علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر شیوخ سے استفادہ کر کے سند و خرقہ اجازہ حاصل کیا
تھا، یہ اسی طویل ریاض اور محنت کا نتیجہ تھا کہ مرحوم کا پایۂ فقہ و حدیث اور رجال



و انساب میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر بہت مشکل ہے، ایک مشاق
مدرس اور ماہر مفتی ہونے کے ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی امتیاز
حاصل تھا، چنانچہ انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں بکثرت کتابیں
یادگار چھوڑی ہیں، جن میں اللآلی المصنوعۃ فی الروایات المرجوعۃ شرح
کتاب الآثار (۳ جلد) کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ (۳ جلد) الدر الثمین، رجال
کتاب الآثار، الاہتداء فی رد البدعۃ شرح بلاغات محمد فی کتاب الآثار خصوصیت
کے ساتھ مفتی صاحب کے تبحر علمی، وسعت نظر، دقیقہ رسی اور بلند ذوق تحقیق و تفحص
کی آئینہ دار ہیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے پورا اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کا علم کتنا
حاضر و مستحضر اور جزئیات فقہ و حدیث و اسماء الرجال پر ان کو کیسا عبور کامل حاصل
تھا، کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ کی تصحیح و تعلیق کی خدمت انھوں نے کامل بیس
سال تک نہایت جانکاہی اور عرق ریزی کے ساتھ مشغول رہکر انجام دی تھی اور غالباً یہی
باعث بقول مولانا ابو الوفا افغانی یہ ایک بہترین تعلیق بن گئی ہے،

فضل و کمال کے ساتھ مرحوم کی شخصیت گوناگوں محاسن اخلاق کی حامل تھی علم اور عمل بہت
کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کی ذات ان دونوں کی جامع تھی، وہ نہایت نیک طینت متواضع
ملنسار، سادہ مزاج، کشادہ دست، خندہ جبیں کریم النفس، مہمان نواز، بات کے مضبوط اور کام کے دھنی تھے
تقویٰ اور دینداری ان کے چہرۂ کمال کے نمایاں خط و خال تھے، وہ باینہمہ وقار، علم بذلہ سنج
بھی تھے، اردو شعر و سخن کا بڑا اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے تھے، ان کے عربی اسلوب نگارش میں بہت
سادگی، دلکشی اور رعنائی ملتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایسے نادرۂ عہد صاحب کمال صدیوں کی گردش
میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ جل شانہ اس مجموعۂ کمالات و اخلاق کی مرقد کو پر نور فرمائے اور اس پر ابر رحمت برسائے

# مطبوعات جدیدہ

**پنچاکیانہ**، مرتبہ ڈاکٹر تارا چند و ڈاکٹر امیر حسن عابدی صاحبان، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، ٹائپ صفحات ۴۰۰ مجلد قیمت تحریر نہیں، ناشر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

سنسکرت کی مشہور کتاب پنچ تنتر (کلیلہ و دمنہ) دنیا کی ان چند کتابوں میں ہے جس کو اس کے اچھوتے موضوع اور دلچسپ طرز بیان کی وجہ سے لازوال شہرت ملی اور دنیا کی بیشمار زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے، فارسی ترجمے ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی کئے گئے، مشہور مغل حکمراں اکبر نے جو ہندوؤں کے علوم و فنون کا بڑا دلدادہ تھا اس کے فارسی زبان میں دو ترجمے کرائے تھے، پہلا اس کے دربار کے نامور انشاپرداز ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے کیا تھا، اور دوسرا خالق داد عباسی نے پنچاکیانہ کے نام سے کیا، اس دوسرے ترجمے کا علم کم لوگوں کو ہے، اکبری عہد کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، حسن اتفاق سے دہلی میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، جس کی مدد سے چند سال ہوئے ملک کے مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند اور دلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے پنچاکیانہ کا متن شائع کیا ہے، فاضل مرتبین کے قلم سے اردو و انگریزی میں ایک پرمغز مقدمہ بھی ہے، اس میں پنچ تنتر کی غیر معمولی اہمیت و مقبولیت، اس کے متعدد زبانوں میں ترجمہ کئے جانے، زیر نظر ترجمے کے متن، زمانۂ تحریر اور دوسرے ترجموں سے اس کا مقابلہ کرکے اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں اور پنچ تنتر کے مشمولات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، مگر مترجم کے حالات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نہیں دیئے جا سکے، شروع میں اصل نسخہ کے دو صفحوں کا عکس اور آخر میں سنسکرت و ہندی الفاظ کا فرہنگ دیا گیا ہے، یہ کتاب شہنشاہ ایران کے عطیہ سے چھپی ہے، اور اس پر ایران کے سابق ہندوستانی سفیر آقائے محمد رضا کا ایک دیباچہ بھی شامل ہے،



**تمغۂ خدمت** - از جناب شورش کاشمیری مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت تحریر نہیں، ناشر: مطبوعات چٹان لاہور پاکستان

پاکستان کی ڈاک کھلتے ہی شورش کاشمیری مرحوم نے اپنی کئی کتابیں بھیجی تھیں، ان میں سے بعض پر ان کی زندگی ہی میں ریویو ہو گیا تھا، مگر بعض رہ گئی تھیں، ان کا تعارف بھی جلد کرانے کی کوشش کی جائے گی زیر نظر کتاب ایوب خاں مرحوم کے دور حکومت میں مصنف کے زمانۂ اسیری کا روزنامچہ ہے، ان کو ۱۹۶۲ء میں مغربی پاکستان کی حکومت نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ۶ ماہ کے لئے گرفتار کیا تھا، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ ساڑھے تین ماہ بعد ہی رہا کر دیئے گئے، اس طرح ۴۰ روز منٹگمری جیل میں اور ۴۶ دن میو ہسپتال لاہور میں نظر بند رہے، اپنے روزنامچہ میں انھوں نے جیل و ہسپتال کے روزمرہ کے واقعات، جیل کے حکام اور ڈاکٹروں کے طرز عمل اور مجرم قیدیوں کی ذہنیت اور پرمشقت زندگی کی تصویر بھی کھینچی ہے، اور اپنی بے گناہی اور حکومت کی زیادتیاں بھی بیان کی ہیں نیز ایوب خاں اور مغربی پاکستان

کے اس زمانہ کے ڈگورنروں ملک امیر محمد خاں نواب کالا باغ اور جنرل موسیٰ خاں کی شخصیتوں پر تبصرہ بھی کیا ہے، شورش مرحوم کے ذہن اور حافظہ میں ماضی کے نہ جانے کتنے واقعات محفوظ تھے، سلسلۂ بیان میں ان کا اور بعض مشہور قومی و سیاسی رہنماؤں کا ذکر بھی آتا گیا ہے، یہ روزنامچہ ان کے پُرزور قلم اور دلچسپ انشا کی خصوصیات سے معمور ہے،

**کسب معاش کا اسلامی نظریہ** مرتبہ جناب حامد علی خاں صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۰۰ قیمت ۲ ؎ ناشر: ڈاکٹر عبد الحق شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی،

اس مختصر کتاب میں کسب معاش کا اسلامی نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس غرض سے وہ آیتیں اور حدیثیں مع ترجمہ و تشریح نقل کی گئی ہیں جن میں کسب معاش کی ضرورت و اہمیت، حلال و حرام میں امتیاز، جائز پیشے اختیار کرنے اور کاروبار میں دیانت داری، راست بازی اور خوش معاملگی کی ترغیب کی گئی ہے، اور ناپ تول میں کمی، ذخیرہ اندوزی اور خیانت وغیرہ کی مذمت بیان کی گئی ہے، آخر میں نمبروار ان احکام و ہدایات کا خلاصہ بھی تحریر کر دیا گیا ہے، جو کتاب میں درج آیتوں اور حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں اور شروع میں اسلام کے فلاح انسانیت کے ضامن ہونے کا ذکر کر کے دکھایا گیا ہے، کہ اس نے عبادات کی طرح معیشت، معاشرت اور اخلاق و سیاست کے متعلق بھی ہدایات دی ہیں اور وہ حلال روزی کی طلب اور کسب معاش کو غیر ضروری قرار نہیں دیتا،

"ض"



جلد ۱۱۹ ماہ اگست ۱۹۷۶ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ عدد ۲

مضامین